۷۸۶

هو العزیز

علمِ مجلسی

معروف بہ

شعروں کی ڈکشنری

حصّہ اوّل

مرتبہ

عزیز الرحمٰن۔ میر منشی۔ قلعہ معلّیٰ۔ دہلی

ملنے کا پتہ۔ مجیبیہ کتب خانہ۔ کلاں محل دہلے

بار پنجم سنہ ۱۹۳۶ء

قیمت ایک روپیہ ۸/

اطلاع رجسٹری

ہر خاص و عام کو بذریعہ تحریر ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ اس کتاب یعنی "علم مجلسی یا شعروں کی ڈکشنری المعروف بہ مجموعہ زندہ دلی" وغیرہ کتاب کے ناموں کی بحق مؤلف حسب ضابطہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری ہو چکی ہے لہذا کوئی صاحب اس کے نام وغیرہ کو تجارتی صورت میں استعمال نہ کریں جس سے اسکی شہرت فروخت یا مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو یا نقصان پہنچے ورنہ ہرجہ و خرچہ کے قانونی ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔

خاکسار عزیز الرحمٰن مؤلف کتاب علم مجلسی یا شعروں کی ڈکشنری معروف بہ مجموعہ زندہ دلی وغیرہ

لیلائے نجد حسن کی ستم آفرینیاں جہاں پیرس کے ہوٹلوں میں کرشمہ ساز ہیں وہاں صحرائے لق و دق میں بھی اپنی ستم رانیوں سے نہیں چوکتیں لیلائے نجد مجنون عامری کی دلدادہ نہیں سلطان نجد والئی حجاز کی دلربا ہے جو اپنے حسن عالمتاب کی ملکہ ہونیکے ساتھ ہی سیاست کی حکومت بھی کرتی تھی ابن سعود نے جو مظالم طائف و مکہ میں کیے انکا بھی اس کتاب میں جزو کل حال درج ہے یہ کتاب جہاں زہد شکن حالات کا مجموعہ ہے وہاں ظلم و تعدی کی بھی داستان گوہ ہے اور عرب و نجد کی ایک جدید الشیوع "تاریخ" بھی ہے۔ قیمت عہ ۲

قتل بہرام نیلی چھتری۔ بہرام کی گرفتاری کے سلسلہ میں یہ ایک نیا ناول ہے اسمیں بہرام نے اپنی حیرت انگیز کارروائیوں کیلئے لکھنؤ کو اپنا جولانگاہ بنایا ہے جابجا تاریخی نکات اور سلاطین اودھ کے مخفی خزانوں کا ذکر ہے سراغرسانی اور جاسوسی کی چاشنی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ محلات شاہی کی شستہ گفتگو ماہ لقا اور بہرام سے عشق کی روئیداد چھتر منزل موتی محل، امام باڑہ بیلی گارد، قیصر باغ وغیرہ کے تاریخی افسانے تاریخی معلومات بہرام کی چالاکیاں پولیس کی سرگرمیاں انداز بیان کی ندرت کے ساتھ نہایت دلفریب ہے۔ قیمت ۹؍

مثنوی میر حسن جس سے بہتر مثنوی لکھنا ناممکن ہے۔ قیمت ۳؍

ھُوَ العَزِیز

علم مجلسی

معروف بہ

شعروں کی ڈکشنری

حصّہ اوّل

مرتبہ

عزیز الرحمن۔ میر منشی۔ قلعہ معلی۔ دہلی

ملنے کا پتہ۔ مجیبیہ کتب خانہ۔ کلاں محل دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامین

علم مجلسی حصۂ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم مجلسی

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

زندہ دل بزرگوں۔ خوش طبع نوجوانوں اور شگفتہ مزاج دوستوں کی خدمت میں سب سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا۔ کہ اس کتاب کی ترتیب تدوین اور اشاعت سے اس ہیچمدان کو نہ اپنی کسی قابلیت علمی کا اظہار مقصود ہے نہ لیاقت علمی کا اعلان منظور ہے۔ نہ دنیاوی نام ونمود کی خواہش ہے۔ اور نہ اپنی ذاتی شہرت کا ارمان ہے۔ کیونکہ اگر بفرض محال چند روز کیلئے نام پیدا ہو بھی جائے تو آخر حاصل کیا۔ بقول جناب اکبر الہ آبادی مرحوم ؎

بھلا ہی دیتی ہو جسکو دنیا۔ مٹا ہی دیتا ہو جس کو گردوں
عبث ہے انسان چاہتا ہے۔ جو نام ایسا نشان ایسا

اب ایک سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے۔ کہ میں نے اس کتاب کو کیوں مرتب کیا اس کا جواب نہایت سچائی کے ساتھ یہ ہے کہ ہر قوم۔ ہر فرقہ۔ ہر گروہ۔ ہر سوسائٹی اپنی دلچسپی کیلئے کچھ نہ کچھ مذاق ضرور رکھتی ہے۔ دوسری باتوں کیطرح

ہندوستان بھی اس لحاظ سے کسی ملک سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں دوست احباب شام کو ایک جگہ مجتمع ہو کر علمی مباحثہ کیا کرتے تھے اور دوران بحث میں لطائف وظرائف۔ بذلہ سنجیاں۔ شستہ مذاق۔ ضلع۔ جگت وغیرہ کی دلچسپیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ جو نہ صرف وقت گزاری کا ذریعہ بنتی تھیں۔ بلکہ دل و دماغ کو اُن کا خوش کن اثر متاثر اور محظوظ کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اُن کی علمی واقفیت کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ اُن کی ذاتی قابلیت اور مجلسی معاشرت میں حیرت انگیز ترقی ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ عام لوگ بھی اُن کی صحبت میں بیٹھ کر۔ اُن کی باتیں سُنکر اور اُن کی نکتہ آفرینیوں سے فائدہ اُٹھا کر "اَلصُّحْبَۃُ مُتَاَثِّرٌ" کا صحیح نمونہ پیش کرتے تھے۔ لوگ اُن کی باتیں سُننے کے مشتاق رہتے تھے۔ جہاں جاتے۔ جدھر سے گزرتے جس گلی یا کوچہ میں قدم رکھتے تھے۔ یہی آواز آتی تھی کہ ؎

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اَے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

اُنہوں نے موقع محل دیکھ کر۔ اور سامعین کے مذاق کا اندازہ لگا کر ایسی دلچسپ باتیں چھیڑیں کہ سب ہمہ تن گوش ہو کر اُن کی باتیں سُننے اور محو حیرت ہو کر اُن کا مُنہ تکنے لگے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ؎

خاموش ہوں اُس شوخیٔ گفتار کے آگے

تصویر کی صورت ہے مری یار کے آگے

اب تو نہ وہ لوگ رہے۔ نہ وہ علمی چرچے۔ وہ بزمیں سونی اور صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ وہ علمی شمعیں جن کے دم سے محفلوں میں روشنی رہتی تھی کافور ہو گئیں وہ ادبی ستارے جو بزموں کی رونق ہوتے تھے۔ فنا کے بادلوں میں غروب

ہو گئے۔ اور وہ لوگ جو جلسوں کو اپنی بذلہ سنجی سے گونجا دیتے تھے۔ خُدا جانے کون کون سے تاریک گوشوں میں تنہا اور خاموش پڑے ہوئے قیامت کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔ آہ ؎

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں۔ وہ نقشے یاد ہیں
کیسی کیسی صحبتیں۔ خوابِ پریشاں ہو گئیں (ثابت لکھنوی)

انقلاب کی بے پناہ شمشیر نے "علمِ مجلسی" کا تو خون ہی کر ڈالا۔ مذاقِ سلیم بھی خدا جانے فنا ہو جانے کے بعد کونسی گور میں دفن ہو گیا کہ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اُلفت و مُحبت۔ خُلق و مروّت۔ ہمدردی و پاسِ وفا وغیرہ خوبیاں جو پہلے معیارِ شرافت اور جزوِ ایمان سمجھی جاتی تھیں۔ اُن کا بھی اب نام ہی نام رہ گیا ہے ؎

یہ خلاف ہو گیا آسماں یہ ہوا زمانہ کی پھر گئی
کہیں گُل کھلے بھی تو بُو نہ دی۔ کہیں حسن ہے تو وفا نہیں (آتش لکھنوی)

غضب خدا کا جہاں دو چار احباب جمع ہوئے۔ اور اُن میں کوئی چُلبلی اور چلتی ہوئی طبیعت کا شخص ہوا تو اُس نے فضول اور بیہودہ باتوں کا وہ طومار باندھا کہ خدا کی پناہ نہ موقع نہ محل۔ نہ سر نہ پاؤں۔ نہ چاشنی نہ ملاحت۔ کوئی صاحب اگر جواب نہ دے سکے تو کھسیانے ہو کر اپے سے باہر۔ گالی گلوج یہانتک کہ دھول دھپّہ پر اُتر آئے اور اس طرح اپنی خِفّت کو مٹایا۔ بات ایسی فرمائی گویا کسی نے لٹھ مار دیا پھر نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ مُنہ سے کیسی ہی اَونگی بَونگی نکلے کچھ پرواہ نہیں مگر اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ ؎

کسی میں دم ہی نہیں ہے تو دم بھریں کس کا
بزرگ ہی نہیں باقی۔ ادب کریں کس کا (اکبر الہ آبادی)

اِس افسوسناک حالت کو دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ کوئی کتاب ایسی لکھنی چاہئے

جس سے مذاق سلیم اور علم مجلسی کے مردہ جسم میں ازسرِ نو جان آجائے اور فنا شدہ علمی اور ادبی شان و شوکت کا پرچم جا بجا لہرانے لگے۔ لوگ اپنے خیالات اور جذبات کو شستہ اور پاکیزہ الفاظ میں کما حقّہٗ ادا کر سکیں۔ ان کا طرزِ بیان۔ ان کی سادگی زبان برجستہ اور برمحل دلچسپی اور دل کشی پیدا کر سکے اور دوسرے الفاظ میں یہ کہ ؎

دل میں کچھ چبھتی ہوئی تقریر ہونی چاہیئے
نالہ کیسا۔ بات میں تاثیر ہونی چاہیئے (بیخود دہلوی)

اب یہ فکر پیدا ہوئی کہ کس قسم کی کتاب لکھی جائے۔ جس سے اس مطلب میں کامیابی ہو۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ایشیائی اقوام نے شاعری کو جزوِ زندگی قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے عرب نے اس کی تخم ریزی کی۔ پھر ایران اور اس کے بعد ہندوستان نے اس باغ کو سینچا۔ یہاں کی ہندی شاعری کو دیکھئے۔ کیسے موثر جذبات۔ کیسے دل کش خیالات۔ کیسی دلفریب اور موہنی طرزِ ادا ہے کہ سنکر دل بیتاب و بے چین ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری نے بھی ایشیائی طرز کا اتّباع کیا۔ وہ اگرچہ ہندی شاعری کے رتبے کو نہیں پہنچ سکی تاہم مقبولیت عامہ کا سہرا اپنے سر پر سجا لیا۔ اب یہاں بات بات پر حسبِ موقع اشعار وردِ زبان رہنے لگے۔ جو لطفِ گفتگو میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ اور سننے والے کی طبیعت پر بجلی کا سا اثر کرتے تھے ؎

ڈال دے جان معانی میں۔ وہ اردو یہ ہے
کروٹیں لینے لگے طبع۔ وہ پہلو یہ ہے (اکبر الہ آبادی)

اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچا کہ کیوں نہ شاعرانِ باکمال اور ناظمانِ بےمثال کے دلچسپ کلام اور ان کے عمر بھر کے تجربہ شدہ اقوالِ زرّیں سے فائدہ اٹھایا

جائے جنہوں نے اپنی تمام زندگی کا ایک ایک لمحہ زبان کی بہتری اور قدر دانانِ سخن کی دلچسپی اور بہبودی کے لئے وقف کر دیا۔ ایسی ایسی برمحل مفید اور کارآمد باتیں نظم کی دل کش صورت میں بیان کیں کہ اگر تمام دُنیا کے عاقل اور حکیم مجتمع ہو کر جمع بھی کر لیں۔ تو اُن میں یہ تاثیر اور دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی ؎

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکا خیال　　(آتش)
فکرِ رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرداز کا

لیکن میں نے کیا کیا؟ محض اشعار جمع کر لینا اور چھپوا کر شائع کر دینا تو آسان سی بات ہے۔ البتہ ان کی ترتیب اور تقررِ عنوان دل لگی نہیں۔ اس لیئے میں نے دینی اور دُنیاوی امور کے متعلّق ضروری اور مزیدار عنوان قائم کر کے اُن کے تحت میں چیدہ چیدہ۔ برجستہ۔ کارآمد اشعار کا ذخیرہ مختلف کتابوں۔ رسالوں اور ناولوں کی ورق گردانی۔ احباب کی قیمتی امداد۔ اور بعض حضرات کی زبانی یاد سے ناظرین کی دلچسپی اور کار برآری کے لئے جمع کیا ہے ؎

سمجھے وہی اس کو۔ جو ہو دیوانہ کسی کا　　(اکبر الٰہ آبادی)
اکبؔر یہ غزل میری ہے افسانہ کسی کا

ساتھ ہی لُطفِ خیال۔ لطفِ زبان۔ بلندیٔ تخیل۔ حُسنِ بیان۔ سلاست وندرت۔ جذبات کی خوبی۔ مضامین کی رفعت۔ بندش کی سادگی۔ دلفریبی اور دل آرائی کے خیال کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہی اشعار انتخاب کئے۔ جو زبان سے نکلتے ہی کانوں کے راستے سے دل میں اُتر جائیں۔ علمی قابلیت سے کام لینے اور دل و دماغ کو غور و فکر کی بندشوں میں جکڑ دینے کی ضرورت نہ ہو اور موقع محل پر اُن کا ادا ہونا گفتگو میں سونے پر سہاگہ کا کام دے۔ اشعار دُنیاوی معاملات میں رہنمائی اور عقبیٰ کے راستہ کی ہدایت کریں۔ اور ہر شخص خواہ وہ کسی عمر

اور کسی طبقہ کا ہو اپنے مذاق کے موافق ان سے فائدہ حاصل کر سکے ؎

مرقّع مستیوں کا۔ آئینہ ہے زہد و تقویٰ کا
عصا ہے پیر کے حق میں۔ جواں کو عیش کا نقشہ
نصیحت کا خزانہ ہی۔ مگر دلچسپ اور زیبا
یہ بچوں کا کھلونا۔ میکشوں کیواسطے صہبا
یہ تصویر عبادت ہے۔ یہ تنویرِ قناعت ہے
یہ فوٹو وصل کا۔ آئینۂ شب ہائے فرقت ہے

دُنیا میں ہر مزاج۔ ہر قماش۔ اور ہر رنگ کے آدمی ہیں۔ ایسا کوئی شخص نہیں جسکو کہیں نہ کہیں بولنے کی ضرورت نہ ہو۔ کسی کو منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کہنا پڑتا ہے کوئی سنگھاسن پر بیٹھ کر کتھا بچھاتا ہے۔ کوئی پہلو بدل بدل کر اپنے گاہک کو پرچاتا ہے۔ کوئی اپنی کار برآری کے واسطے کسی کی خوشامد کرتا ہے اور طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ سے کام لیتا ہے۔ بہت سے شوقین حضرات جلسوں میں۔ محفلوں میں۔ مختلف بزموں اور سوسائٹیوں میں اور خدا جانے کہاں کہاں جاتے ہیں۔ اور ایسا کونسا شخص ہے جو اپنا دل کسی نہ کسی جگہ خوش کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ دل خوش کرنے کے لئے بھی لیاقت ضروری چیز ہے۔ اور لیاقت کی طرح قابلیت لابدی۔ ورنہ جناب ریاض کے اس شعر کے صحیح مصداق ہیں ؎

نہ آیا ہمیں۔ عشق کرنا۔ نہ آیا
مرے عمر بھر۔ اور مرنا۔ نہ آیا
(ریاض گورکھپوری)

اب وہ حضرات جو گفتگو نہ کر سکنے کے سبب محفلوں میں طوعاً و کرہاً خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ یا بے موقع اور بے محل زبان کھولنے پر ان کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے۔ یا جو سامعین کے دلوں پر قابو نہیں پا سکتے۔ یا جو باتوں باتوں میں کسی کو اپنا نہیں بنا سکتے۔ آئیں اور اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اُن کے قفلِ دہن کی کلید ہے

اب نہ اُن کو کسی کی پھبتیوں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ نہ کسی سے خفت اور شرمندگی کے ساتھ سر جھکانا پڑے گا۔ وہ ہر جگہ بلبلِ ہزار داستاں کی طرح چہکیں گے اور ہر قسم کی بزم میں فخریہ یہ کہہ سکیں گے کہ ؎

بند باتوں میں۔ کسی سے تھیں رہنے والے
ہم تو اے غنچہ دہن۔ منہ پہ ہیں کہنے والے
(امیر مینائی)

اسی طرح ناظرین کے منظورِ نظر ہمنشین و ہم مشرب اگر اپنے مطلب کو کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ تو وہ اُن کو بھی یہ مجموعہ دکھائیں۔ اور ان کی میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری باتوں سے وہی لطف اُٹھائیں گے۔ جیسے گراموفون میں جو گانا چاہیں بھر دیں۔ اور پھر اس کو بجا کر اپنا دل خوش کر لیں۔ اِس مجموعہ کے مطالعہ سے اُن کے محبوبِ دلنواز و غنچہ دہن چہک کر بلبلِ ہزار داستاں اور طوطیِ شکر مقال کو مات دیں گے۔ اور اپنے مطالب کو خوب واضح طور سے ادا کر سکیں گے۔ بلکہ ایک ایک کی چار چار سُنائیں گے۔ اور اپنے محسن کو اِس بات سے مایوس ہونے کا موقعہ نہ دیں گے کہ ؎

دل میں مضموں تھا جو اُس شوخ کے ظاہر نہ ہوا
رہ گئی مجھ کو یہ حسرت۔ کہ وہ شاعر نہ ہوا
(امیر مینائی)

یہ سچ ہے کہ خدا نے بات میں بڑی تاثیر دی ہے۔ اگر بات برمحل حسبِ موقع۔ برجستہ اور خوشگوار ہو تو وہ جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ جس بھاگوان کو اپنی خوش قسمتی سے برمحل موقع کی چھیڑ چھاڑ۔ شُستہ ہنسی مذاق۔ پاکیزہ حاضر جوابی لطیفہ گوئی۔ بذلہ سنجی میں مشّاقی نصیب ہے اس کی تقدیر کی تو قسم کھانی چاہیئے کیونکہ اُس کے واسطے تو ساوی عیش ہی عیش لکھتے ہیں۔ مرادِ دلی اُس کی ادنیٰ کنیز۔ اور عیش اس کا بندۂ بے دام ہے۔ اس کو نہ خرچ کی ضرورت

نہ سعی کی حاجت - بڑے بڑے نخرے اور غرور و تمکنت والے اس کی باتوں کے مشتاق رہتے ہیں - اس نے ذرا زبان ہلائی - اور دلی تمنا بر آئی ؎

کیڑا ذرا سا - اور وہ پتھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا - نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے (استاد ذوق)

ہر محفل - ہر جلسہ میں ایسے خوش قسمتوں کے آنے کی گھڑیاں گنی جاتی ہیں منّتیں مانی جاتی ہیں - دعائیں کی جاتی ہیں - شگون لیئے جاتے ہیں اور فالیں کھولی جاتی ہیں - بُلانے کے لیئے قاصد بھیجے جاتے ہیں - اور حاضرینِ محفل کا یہ حال ہوتا ہے - کہ اُمّید و یاس کی حالت میں بیتاب و بے قرار ہو ہو کر دروازے کی طرف تکتے رہتے ہیں ؎

دل میں ہے اُنکی یاد - نگاہوں میں اُن کی شکل
آنکھیں ہیں - مدّتوں سے سوئے در لگی ہوی

ادھر انہوں نے دروازے میں قدم رکھا - اور سب خوشی سے اُچھل پڑے آیئے آیئے - تشریف لایئے ! کے نعروں سے تمام مکان گونج اُٹھا - آپ آکر بیٹھے تو کس طرح - کسی پر مہذّب الفاظ میں آوازہ کستے ہوئے - کسی بچارے پر نہایت متانت کے ساتھ پھبتی اڑاتے ہوئے - کسی شامت کے مارے کو نہایت ادب کے ساتھ بناتے ہوئے - غرض ہنساتے ہنساتے لوگوں کے پیٹوں میں بل ڈال دیئے - بزم کا رنگ ہی بدل دیا - بیشک اگر وہ یہ دعوے کریں تو بالکل بجا اور درست ہے کہ ؎

میں اگر ڈون کی لیتا ہوں - بجا لیتا ہوں
باتوں باتوں میں - فرشتوں کو لگا لیتا ہوں

لفظ جو میرا ہے - ڈوبا ہوا تاثیر میں ہے
بڑھ کے ہر جادو سے - جادو مری تقریر میں ہے

میری خواہش وصلِ ہر طفل و جواں پیر میں ہے   یاد ہر دم میری ۔ بزم بت بے پیر میں ہے

میں حسینوں کو محبت میں پھنسا لیتا ہوں

پھر کمال کی تو یہ بات ہے ۔ کہ اس قسم کے لوگ جس جلسہ میں جاتے ہیں اُسی رنگ کے بن جاتے ہیں ۔ مولویوں میں جائیں تو اچھے خاصے مجتہد العصر نظر آئیں ۔ عابدوں میں عابد ۔ اور زاہدوں میں زاہد کہلائیں ۔ اور اگر چلتے پھرتے گھومتے گھامتے کسی میکدہ میں پہنچ جائیں تو رندوں کے قبلہ گاہ بن جائیں بقول حضرت اکبر الٰہ آبادی ؎

مری رسائی ہے دیر میں بھی حرم میں بھی میری منزلت ہے

بتوں سے بوسہ کی ہے توقع ۔ خدا سے اُمّیدِ مغفرت ہے

یہ تو مسلمہ امر ہے کہ شعر ہی ایسی چیز ہے ۔ جو کسی محفل میں پڑھا جائے تو اُس کے کھٹکے سے بزرگ اور سن رسیدہ اصحاب کے کان بھی کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ان کے مردہ بدن میں ایک نئی روح آجاتی ہے ۔ ان کی خشک اور مرجھائی ہوئی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے ۔ عالمِ شباب کی ولولہ خیزیاں جوانی کی مردانہ اُمنگیں اور نوعمری کی پُرلطف کارروائیوں کا سین ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ دل بھر آتا ہے ۔ آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور یہ پُر اثر شعر بالکل اُن پر صادق آتا ہے کہ ؎

دلمیں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا + (صبا لکھنوی)

اُن کے چہرے سے حسرت برستی ہے ۔ ان کی آنکھوں سے مظلومیت ٹپکتی ہے ۔ ہنسی بھی آتی ہے ۔ اور رونا بھی ۔ گو بظاہر لاحول پڑھتے ہیں ۔ لیکن حقیقت نما آہ سرد اس طرح اُن کے چوٹ کھائے ہوئے بیقرار دل

کی ترجمانی کرتی ہے۔ کہ ؎

ظاہر ہے بے بیاں کئے رازِ نہانِ دل — نالہ زبانِ حال سے ہے ترجمانِ دل
پُردرد و پُرالم ہے بہت داستانِ دل — دل اپنا تھام لے۔ جو سُنے کچھ بیانِ دل
سوزِ جگر ہے دل میں قیامت کا درد ہے
آفت میں جانِ زار ہے اور رنگ زرد ہے

یاد آگیا ہے۔ عہدِ جوانی کا رنگ ڈھنگ — وہ ولولہ۔ وہ شوق۔ وہ اطوار وہ اُمنگ
وہ عیش وہ نشاط وہ دلچسپیاں وہ رنگ — معشوق و بادہ۔ ساغر و شیشہ رباب و چنگ
فصلِ بہار۔ صحنِ چمن۔ شامِ ناز تھی
ہر ساعتِ شباب۔ مسرّت طراز تھی

کسی بزرگوار سے ضبط نہیں ہو سکتا جوش میں آکر اپنے عہدِ شباب کی کارگزاریوں کا کچّا چٹھا سنا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ؎

حسینوں سے محبت کے وسائل ہم بھی رکھتے تھے — جگر زخمیِ تیغِ نازِ قاتل ہم بھی رکھتے تھے
نگاہِ شوق معشوقوں پہ مائل ہم بھی رکھتے تھے — بتانِ شعلہ رُو سے گرم محفل ہم بھی رکھتے تھے
کبھی تھی جان ہم میں بھی۔ کبھی دل ہم بھی رکھتے تھے

کبھی ہم بھی کسی کے عشق میں سرشار رہتے تھے — کبھی ہم بھی کسی کے ہجر میں خونبار رہتے تھے
کبھی ہم بھی کسی کی یاد میں بیدار رہتے تھے — کبھی ہم بھی کسی بُت کے گلے کا ہار رہتے تھے
کبھی پہلو میں اک زہرہ شمائل ہم بھی رکھتے تھے

کوئی بڑے میاں جن کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ شیب میں بھی شباب کا دم بھرتے ہیں۔ وہی مثل ہے کہ رسّی جل گئی پر بل نہ گیا ترنگ میں آکر نوجوانوں کو فخریہ سُناتے ہیں کہ ؎

گو پیر ہوں پر زور جوانی ہے ابھی تک　　سوکھے ہوئے دریا ہیں روانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں۔ پر تیز زبانی ہے ابھی تک　　قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک

دم خم وہی۔ چم خم وہی۔ گھر گھاٹ وہی ہے
تلوار تو کہنہ ہے۔ مگر کاٹ وہی ہے

جب بڑے بڑے سن رسیدہ بزرگوں کا یہ حال ہو۔ تو بیچارے نوجوان جنہوں نے منزلِ شباب میں خیر سے پہلا ہی قدم رکھا ہے۔ جو کچھ نہ کریں کم ہے۔ بقول شخصیکہ نیولے کا منہ کھائے تو لال نہ کھائے تو لال۔ ہاں ہاں اس میں کلام نہیں کہ ؎

جوانی آدمی کی۔ مایۂ الزام ہوتی ہے
نگاہِ نیک بھی۔ اس عمر میں بدنام ہوتی ہے

میرے ایک نوجوان دوست فرماتے ہیں کہ مجھے شعر و سخن کا شوق تو ہمیشہ سے ہے۔ مضامین کے بھی دل و دماغ میں انبار رہتے ہیں۔ لیکن شعر کہنا تو کجا۔ شعر چرانے کی لیاقت بھی آجتک پیدا نہ ہو سکی۔ علاوہ اس کے مُفت کی رسوائی کا خوف غالب تھا۔ کیونکہ جناب آتش پہلے ہی متنبہ کر گئے ہیں کہ ؎

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چکھی خراب کرتی ہے۔ مالِ حرام کی

اس سے قطع نظر کرتے ہوئے نہ اپنا ضمیر اور نہ غیرت ہی اس بات کو گوارا کرتی تھی۔ کہ کسی فیاض دل۔ روشن طبع شاعر سے شعر کہلواؤں اور اپنے نام سے مشہور کروں۔ کیونکہ یہ بات بھی یار لوگ تاڑ جاتے ہیں۔ گو لحاظ سے منہ پر صاف نہیں کہتے۔ لیکن پسِ پشت بہت چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ اور موجودگی میں بھی ان کے اشارے کنائے چور کی ڈاڑھی میں تنکے کا کام دیتے ہیں جس سے غیر تمند

آدمی کے لئے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ چنانچہ اُستاد ذوق فرماتے ہیں ؎

نہ پکڑیں دامنِ الیاس۔ گردابِ بلا میں ہم
کہ بہتر ڈوب کر مرنے سے۔ جینا ہے سہارے کا

غرض یہ کہ خود شعر بنانے کے لئے بہتیرا سر مارا۔ مگر فاعلُ فاعلاتُن ہی کے غاروں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ شعر کے شین سے آگے بڑھا تو عین کی دلدل سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ کیونکہ ع ہی وہ چشمہ ہے جو آگے چلکر کلیجہ شق کر دیتا ہے! اور ایک ایسی شق پیدا ہوتی ہے جو عین سے ملکر عشق کا خوفناک سمندر ترقی کے راستہ میں حائل کر دیتی ہے۔ یہ اشعار حسبِ حال ہیں ؎

پڑھے ہیں عشق کا دفتر الف ب ت نہ ہم سیکھے
نہ تختی ہاتھ میں پکڑی نہ ہم چھوٹا قلم سیکھے
فقط اِس عشق کے دفتر میں ہم تا اِم صنم سیکھے
سوائے عشق و اُلفت ہم نہ کچھ اپنی قسم سیکھے

ہمیشہ جان کھوتے ہیں۔ مگر کھونا نہیں آتا
قیامت ہے کہ روتے ہیں۔ مگر رونا نہیں آتا

اس وارفتگی کا عالم جب ان کو خود شعر گوئی پر قادر ہونے کا موقع نہ دے سکا تو بڑے بڑے اُستادوں اور شوخ طبع و زندہ دل شاعروں کے تڑپا دینے والے اشعار جمع کر کے۔ اور کتابِ دل پر لکھ کر اپنے شوق کو پورا کیا ؎

جو حوصلہ کیا۔ ارمانِ دل نکل ہی گیا
غرض کسی نہ کسی طرح۔ کام چل ہی گیا

گویائی اور حاضر جوابی کی بدولت حق کو ناحق اور ناحق کو حق ثابت کر دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک حضرت شوقین مزاج تو تھے ہی۔ ہر وقت لہو و لعب میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک نیک نفس بزرگ نے ازراہِ ہمدردی ان کو نصیحت کی کہ انسان کو مناسب ہے کہ خدا کی عبادت میں مشغول رہے اس کی نعمتوں کا شکریہ

ادا کرے اور شیطانی افعال سے پرہیز کرے یہ حضرت ایک ہی تیز طرار تھے۔ اپنی نرالی منطق سے اُن کا دم ایسا بند کیا۔ کہ بیچارے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ دوران بحث میں یہ قطعہ اُن کو سنایا ؎

چھائی ہوئی گھٹا ہو چھلکتے ہوں آبجو
تانیں لگا رہے ہوں۔ کسی سمت خوش گلو
آتی ہو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھینی بھینی بو
اور ہو شراب و خلوت و معشوقِ خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے۔ جو تو ہو تو کیا کرے

پہلو میں ہو اگر کوئی محبوبِ دل نواز
اُلفت کا ہو چھڑا ہوا۔ آپسمیں سوز و ساز
آفت کی چھیڑ چھاڑ کرے گر وہ مستِ ناز
اُٹھ جائے غیریت کا۔ جو خلوت میں امتیاز
سچ کہنا۔ پھر بھی کیا یوں ہی یادِ خدا کرے

ٹھنڈی ہوا ہو۔ ابر ہو کالی گھٹا بھی ہو
فصلِ بہار بھی ہو۔ چمن بھی فضا بھی ہو
مے بھی ہو۔ اور جام بھی ہو۔ دلربا بھی ہو
ہو چنگ بھی۔ رباب بھی۔ نغمہ سرا بھی ہو
اِن نعمتوں کا شکر نہ کیا تو ادا کرے

خدا کی قدرت کے کارخانے عجیب ہیں۔ مذکورہ بالا قطعہ کو ایک شخص اپنے افعالِ بد کی حمایت میں فخریہ پڑھتا ہے۔ اور مونچھیں مروڑتا ہے۔ جب کہ دوسرا اس کو سن کر توبہ استغفار پڑھتا اور کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ اسی طرح تماشہ گاہِ عالم کے اسٹیج پر ہزاروں۔ لاکھوں اور کروڑوں ایکٹر آتے ہیں اور اپنے اپنے پارٹ جو اس تماشہ گاہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ ڈائرکٹر بلا شرکتِ غیری مالک و منیجر کی طرف سے ان کو دیئے گئے ہیں۔ ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ اِس تماشہ گاہ کے پردوں کی خوشنمائی۔ سین سینریوں کی دل کشی اور ہر تماشہ کے کسی خاص حصہ کے بعد ڈراپ سین کی عبرت انگیزی یہ تمام باتیں ایسی ہیں۔ جن کو لفظوں میں ادا کرنا میرے احاطۂ امکان سے باہر ہے

اور میری حدِّ تحریر و تقریر سے بلند و برتر ہے

کیا کہوں میں کس غضب کی یہ تماشہ گاہ ہے
جسکا مالک۔ خالقِ کُل یعنی خود اللہ ہے
ایکٹر جو ہے وہ دن کو مہر شب کو ماہ ہے
اپنے فرضِ منصبی سے ہر طرح آگاہ ہے
لاکھ پردے۔ اور ہر پردے میں یکتائی کا رنگ
سین جو ہے۔ آئیں ہے۔ قدرت کی زیبائی کا رنگ

جو تماشہ ہے۔ وہ اک مجموعۂ اسرار ہے
جا بجا نیرنگیوں کی گرمئ بازار ہے
ہیں مُرقّع حُسن کے۔ یا مطلعِ انوار ہے
شور و شر کی جنگ ہے اور بحثِ نُور و نار ہے
ساز جو ہے۔ اِس تماشہ گاہ میں۔ پُر سوز ہے
تان۔ پلٹا۔ تال۔ سُر۔ جو کچھ ہے وہ دلدوز ہے

قیامت تو یہ ہے کہ دُنیا ایک ہے۔ مگر دُنیا والوں کا مذاق ایک نہیں۔ مزاج ایک نہیں۔ صورتیں ایک نہیں۔ رنگ ایک نہیں۔ طبیعت ایک نہیں۔ عادت ایک نہیں۔ جذبات ایک نہیں۔ خیالات ایک نہیں۔ ایک خدا کی مخلوق اور ہزاروں۔ لاکھوں اختلافات کا مجموعہ ہے

جسکو دیکھو وہ عجب رنگ کا متوالا ہے
گندمی کوئی۔ کوئی گورا۔ کوئی کالا ہے
کوئی معشوق ہے۔ عاشق کوئی دل والا ہے
کوئی ادنےٰ ہے زمانہ میں کوئی اعلیٰ ہے
کوئی اللہ کا بندہ ہے صنم خانے میں
کوئی گلشن میں ہے شاداں کوئی ویرانے میں

کوئی شوقین فدا بادۂ انگور پہ ہے
کوئی قربان یہاں ساغرِ بلّور پہ ہے
شیفتہ کوئی کسی عارضِ پُر نور پہ ہے
کوئی پریوں پہ تصدّق تو کوئی حور پہ ہے
کوئی مصروف ہے دن رات سیہ کاری میں
کوئی مشغول ہے تدبیرِ ستم گاری میں

کوئی ہے علم پہ نازاں کوئی فن پر مغرور
کوئی اخلاق کا بندہ کوئی اخلاق سے دور
کوئی شوقینِ ادب لطفِ زبان سے مسرور
کوئی تاریخ کے اوراق پہ رکھتا ہے عبور

کوئی قربان دل و جاں سے فصاحت پر ہے
بہ سر و چشم فدا کوئی بلاغت پر ہے

ایک رکھتا ہے اگر دل میں تمنائے وصال
دوسرا جانتا ہے ہجر کو معراج کمال
الغرض اہلِ جہاں کا نہیں ایک رنگ پہ حال
شاد شادی سے ہے کوئی تو کوئی غم سے نڈھال

کوئی واعظ۔ کوئی زاہد۔ کوئی شیدائی ہے
ہے تماشا کوئی۔ اور کوئی تماشائی ہے

ایسی حالت میں کسی کو نہ کسی کی پسند پر حرف رکھنے کا حق ہے نہ اعتراض کا مجاز شعر و شاعری بھی اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے۔ کسی کو مضمون کی بندش میں شوکتِ الفاظ اور لطافتِ معنی کی تلاش ہے۔ کسی کو زبان کی سادگی اور محاورات کی برجستگی کا خیال۔ کوئی صنائع بدائع اور استعارات و تشبیہ کا دل دادہ ہے۔ اور کوئی معاملہ بندی کی صفائی اور بیان کی دل کشی پر لوٹ جانے کے لئے آمادہ ہے۔

اب رہے خود شاعر تو اُن کا بھی یہی حال ہے۔ مبالغہ میں واقعی کمال ہے۔ کمر کی نزاکت دکھائیں گے تو معشوق کی کمر کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے خود ہی غائب ہو جائیں گے۔ دہن کی تشریح میں قافیہ تنگ ہو جانا تو ایک معمولی بات ہے۔ لعاب دہن کا خیال ریشہ خطمی بنا دینے کے لئے موجود۔ رخسارِ یار کی تجلّی کے سامنے خورشید و قمر کی روشنی تک مفقود۔ لب لعلیں کے رنگ سے لعل و یاقوت کو شرم آئے۔ ہونٹوں کی جنبش اور جنبش کے اعجاز کو دیکھ کر مسیحا بھی شرمائے زلفوں کی تعریف میں رسی کو سانپ بنا دینا۔ ناک کی تعریف میں پُل کے پل باندھکر

دکھادینا۔ کبھی سراپا کا بیان۔ کبھی شوخی اور شرارت کی داستان۔ کبھی رفتار کی تعریف۔ کبھی گفتار کی توصیف۔ کبھی ہجر کی شکایت۔ کبھی وصل کی حکایت۔ کبھی کرم کا شکریہ عنایت کا صلہ۔ کبھی ستم کا شکوہ تغافل کا گلہ۔ کبھی معشوق سراپا محبّت کبھی دشمن بے مروّت۔ کبھی خلیق و رحم دل۔ کبھی نرا خونی۔ جلّاد۔ بیوفا۔ قاتل۔ کبھی بیوفائی میں انتخاب۔ کبھی وفاداری میں لاجواب۔ غرض جو بات ہے۔ انوکھی اور نرالی۔ دن کو رات اور رات کو دن بنانے والی۔ اگر فرض کیجئے کہ اُن میں یہ باتیں ہیں بھی تو کسی کو کیا۔ اُن کو مبارک رہیں۔ حضرتِ اکبر الٰہ آبادی کیا نکتہ کی بات فرماتے ہیں ؎

تعجّب ہے مجھے ان شاعروں کے شور و غوغا پر
کوئی پوچھے کہ تم کو کیا جو کوئی خوبصورت ہے

پہلے زمانہ کے حسین جب اپنی تعریف و توصیف کا طومار سنتے تھے تو بیچارے خوشی سے پھول جاتے تھے۔ لیکن زمانہ کے انقلاب کے ساتھ ہی اُن کی بھی طبیعتیں بدل گئیں۔ نئی روشنی کے شمع رو بھی روشن ضمیر ہو گئے۔ چودھویں صدی میں چودہ برس ہی کے سن میں چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ دل کی بات تاڑ لینا نگاہیں پہچان لینا ادنیٰ سی کرامات ہے۔ بھولا بن کے بیوقوف بنانا ان کی ادنےٰ سی شعبدہ بازی ہے۔ اُن کو بھولا سمجھنا سخت غلطی اور ناتجربہ کاری ہے۔ جناب بیخودؔ دہلوی فرماتے ہیں ؎

الزام بھولپن کے۔ اُس بدگمان پہ ہیں
لاکھوں کے رازِ پنہاں جسکی زبان پہ ہیں

وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ ساری تعریفیں صرف اپنا حسنِ تخیّل اور قابلیت دکھانے یا ہم کو بنانے اور اپنا کام چلانے کے لئے ان شاعروں نے گھڑی ہیں

نہ ان کی کچھ اصلیت ہے نہ حقیقت۔ محض یار لوگوں کا زبانی جمع خرچ ہے
چنانچہ وہ بھی بیجا خوشامدین اور بے بنیاد تعریفیں سُنتے سُنتے عاجز آ گئے
اور شرم و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر سینہ سپر ہو کر کلّہ بہ کلّہ جواب دیدیا
چنانچہ معشوقوں کے ان ہی خیالات کو ریاستِ رام پور کے حکمران نواب
یوسف علیخاں صاحب ناظم مرحوم نے نظم کا لباس پہنایا۔ اور جناب
داغ نے اس کو تضمین فرما کر اور بھی چمکایا ہے۔ جس کے کچھ بند دلچسپی
کے خیال سے درج ذیل ہیں ؎

یا کچھ عیاں ہوا۔ اثرِ گرمیِ غذا یا لب پہ۔ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا یا جھوٹ بولنے کی۔ خدا نے یہ دی سزا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در۔ غلط

کیا جھوٹ بولنے کو ملی ہے انہیں زباں یہ کذب۔ یہ دروغ۔ یہ بہتان۔ الاماں
لو صاحب! آفتاب کہاں اور ہم کہاں شاعر ملا رہے ہیں۔ زمین اور آسماں
احمق نہیں۔ نہ سمجھیں ہم اس کو اگر غلط

اس کو یہ دم دیا کہ تجھے جان نذر کی اک آہ سرد بھر کے۔ کیا طورِ بے خودی
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی لو دینے والے ہوتے ہیں ایسے ہی توسخی
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط

میّت کو ڈھونڈھئے۔ تو عدم تک نہیں پتا اُجرت پہ رونے والے مقرر ہیں جا بجا
ہم پوچھتے پھریں۔ کہ جنازہ کدھر گیا یاں اس خیال سے۔ کہیں ٹھیریں ہیں یہ فنا
مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر۔ غلط

عقلمندوں کا قول ہے کہ کسی کی بیجا خوشامد اور حد سے زیادہ تعریف
کرنے سے انسان اس کو متکبّر بنا دیتا ہے۔ اور خود اس کی نگاہوں میں حقیر۔

ذلیل اور سبک بن جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی تعریف آپ کرنے اور اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کا نتیجہ بھی برعکس ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مُشک آنست کہ خود بیوید نہ کہ عطار بگوید۔ پھر اپنی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کیوں کیجائے اور لوگوں کو اُسے ہرزہ سرائی سے تعبیر کرنے کا موقع کیوں دیا جائے ؎

قبولیت کی کرو نہ پروا۔ جو چاہو۔ مقبولِ عام ہونا
جو ڈول ڈالوگے حُسنِ ظن کا تو تمسے یاں بدظنی رہیگی (حالی)

اسی طرح دُور اندیش لوگوں نے ہمیشہ خاموش رہنے کی نصیحت کی ہے اور اس کے بیشمار فائدے بیان کیئے ہیں۔ اوّل تو لوگوں کے دلوں میں خاموش رہنے والے شخص کا بھرم اور وقعت بہت ہوتی ہے۔ گفتگو شروع کرنے سے پہلے ان کو یہ تلاش رہتی ہے کہ یہ کس مذاق کے بزرگ ہیں اور اُس کے سامنے ایسی ویسی بات کہتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ اس کو بھاری بھرکم اور سنجیدہ جیسے ممتاز خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے زیادہ بولنے میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ ترنگ میں آکر اکثر ایسی باتیں بھی مُنہ سے نکل جاتی ہیں جن کا کہنا مناسب نہیں ہوتا۔ یا جن کے کہنے سے انسان کی عزت اور وقعت جاتی رہتی ہے۔ یادہ گو۔ ہرزہ سرا۔ بیہودہ۔ چھچھورا جیسے ذلیل القاب اس قسم کے شخص کے گویا تاریخی نام قرار پا جاتے ہیں۔ خاموشی میں ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ اگر کسی کو خدانخواستہ علم کم اور لیاقت معمولی ہوئی۔ تو ایک عرصہ تک اُن کا پردہ ڈھکا رہتا ہے اور وہ بھی خواہ مخواہ پانچویں سواروں میں گنے جاتے ہیں۔ ان ہی فوائدِ عامّہ کا لحاظ کرکے حضرت امیر مینائی مرحوم نصیحت فرماتے ہیں کہ ؎

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینہ کی پیدا کر۔ دہن تصویر کا (امیر مینائی)

جو لوگ ہوشیار اور دُور اندیش ہوتے ہیں۔ اور ان کو جب بولنے کی ضرورت آپڑتی ہے تو خوب سوچ بچار کر گول مول بات کرتے ہیں۔ کہنے کو سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اور پھر کچھ نہیں۔ چنانچہ جناب بیخود دہلوی اسی طرزِ عمل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے نصیحت فرماتے ہیں کہ ؎

بات وہ کہئے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں
کوئی پہلو تو رہے۔ بات بدلنے کیلئے (بیخود دہلوی)

لیکن جہاں یہ تمام باتیں ہیں۔ وہاں غالباً مجھے یہ عرض کر دینا بھی ضرور چاہیئے کہ جو بات مُنہ سے نکلے یا جو اشعار کسی موقع محل پہ ادا کئے جائیں وہ کسی طرح بھی تہذیب۔ شائستگی۔ اخلاق اور آدابِ محفل کے خلاف نہ ہوں حیاسوز اشعار۔ ہزلیات۔ اور فحش الفاظ۔ مذموم خیالات۔ اور بیہودہ جذبات حاضرین محفل کی طبیعت کو مکدّر کر دیتے ہیں۔ وہ مُنہ سے نہ کہیں تو نہ کہیں۔ مگر ماتھے پر نفرت انگیز شکنیں اُن کے تنفّر کی ترجمانی کر دیتی ہیں۔ بلکہ خود ایسے اشعار کے پڑھنے والے کا ضمیر بھی اس کو لعنت ملامت کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اور وہ اس شعر کو اپنے حسبِ حال پاتا ہے ؎

کُھلتا کسی پہ کیوں۔ مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے (غالبؔ)

قطع نظر اس کے اخلاقی زندگی پر جو اس کا ناگوار اثر پڑتا ہے۔ وہ کیا کم مضرت رساں اور بد انجام کُن ہے۔ پس جب آسانی کے ساتھ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا ممکن ہو تو کیوں نہ اس سے پرہیز کر کے اپنے اخلاق۔ اپنے ادب۔ اپنی معاشرت۔ اپنے تمدّن۔ اپنی ذات۔ اور اپنے ضمیر کو اس گندے۔ زہریلے اور تباہ کن اثر سے محفوظ رکھا جائے ؎

خدا نے نیک صورت دی تو سیکھو نیک باتیں بھی
بُرے ہوتے ہو۔ اچھے ہو کے۔ یہ کیا بدزبانی ہے
(امیر مینائی)

اب اخلاقی منزل کے آگے چلیئے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بڑے بڑے رند وسرکش لوگ جو جوشِ جوانی میں سرشار۔ اور رات دن لہو و لعب میں گرفتار رہتے تھے۔ جام وسبو مے ومعشوق حسن وعشق اور دیگر پانچوں شرعی عیبوں سے سروکار رکھتے تھے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر دین ومذہب سے غافل بزرگوں اور ناصحوں کو دیوانہ سمجھتے اور اُن کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ جیساکہ جناب اکبر الہ آبادی کا اشارہ ہے ؎

موجِ نصیحت اِک طرف۔ دل کی روانی اِک طرف
کُل شیخپورہ اک طرف۔ میری جوانی اک طرف

وہی لوگ آخری عمر میں اُن تمام افعالِ قبیحہ اور علائقِ ناجائز سے نادم ہو کر۔ جام وسبو۔ مے ومعشوق اور ان کے تمام لواحقین پر تبرّا بھیجکر تسبیح اور مصلّے سنبھال لیتے ہیں۔ اور اس الرحم الرّاحمین۔ خالقِ بے نیاز کے سامنے سرِ نیاز خم کر کے اُس کی شانِ غفّاری اور کریمی کا واسطہ دیکر بصد الحاح وزاری اور کمالِ عجز وانکساری اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح اُمیدوارِ کرم وبخشش ہوتے ہیں ؎

یہ تو کس مُنہ سے کہوں میں کہ گنہگار نہیں
اپنی جو حالتِ ناگفتہ ہے اسرار نہیں
خوئے رحمت سے تو کچھ دور نہیں عفوِ خطا
رونا تو یہ ہے۔ میں اسکا بھی سزاوار نہیں

آخر اس لااُبالی زندگی اور لہو ولعب کی حالت کی بھی حد ہوتی ہے فضول خرچی اور مطلبی یاروں کے ہتھکنڈوں کی بدولت باپ دادا کی کمائی برباد ہو جاتی ہے خاندانی عزّت ووقار جاتا رہتا ہے۔ چاروں طرف سے مصیبتوں۔ اور

پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے۔ اپنے پرائے کنارہ کرنے لگتے ہیں۔ کوئی پاس بیٹھنے کا روادار نہیں ہوتا۔ اُس وقت انسان سب چوکڑیاں بھول جاتا ہے اور اس کی آنکھیں کُھلتی ہیں۔ پھر تو اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے۔ بڑا متّقی پرہیزگار بن جاتا ہے۔ وہی مثل صادق آتی ہے کہ "نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی" پھر تو حضرت ہر ایک نوجوان کو نصیحت کرنے کے واسطے خدائی والنیٹر بن جاتے ہیں۔ اور ہر وقت شیطان کے پیچھے تسبیح کی پھانسی اور لاحول کا ڈنڈا لئے پھرتے ہیں ؎

لات دُنیا نے جو ماری۔ بن گیا دیندار وہ
تھی بُری ٹھوکر مگر شیطان رخصت ہو گیا

مگر پیری میں قویٰ کی کمزوری کے سبب۔ افلاس میں خرچ کی ناداری کے باعث یا دُنیا میں کسی اور مجبوری کی وجہ سے اگر توبہ کی تو کیا تیر مارا عبادت و ریاضت۔ اتّقا و پرہیزگاری تو وہ ہے کہ جوانی۔ صحتِ جسمانی۔ خوشحالی و کامرانی کے زمانہ میں نفسِ سرکش کا سر توڑ کر اپنے پیدا کرنے والے کو یاد کرے اور اُس کی دی ہوئی نعمتوں کا شکریہ ادا کرتا رہے۔ اور اُس کے احکام کی پابندی کرے کہتے ہیں کہ اللہ میاں بھی بُڈھوں کی نسبت جوانوں کی عبادت کو زیادہ پسند کرتے ہیں ؎

سفر ہے پیش توزادِ سفر بھی تو کر لو | یہی تو دن ہیں غنیمت جو تم سے ہو کر لو
نہ ہوگا پیری میں کچھ اب جو کر سکو کر لو | خدا کی یاد۔ جوانی میں غافلو کر لو
وگرنہ وقتِ فضیلت تمام ہوتا ہے

مذکورۂ بالا بیان سے یہ مطلب ہے کہ اِس کتاب میں عاشقانہ۔ ناصحانہ ظریفانہ اشعار۔ متفرق مذاق اور مختلف طبائع کے شائقین کے لئے جمع کئے

گئے ہیں۔ اِس بات کا بھی خصوصیت کے ساتھ خیال کیا گیا ہے۔ کہ خلافِ اخلاق اور فحش اشعار درج کرنے سے احتراز کیا جائے۔ اب رہے عاشقانہ اور ظریفانہ اشعار۔ البتہ اُن سے ایک حد تک دل خوش ہو سکتا ہے۔ مگر روح خوش کرنے کے لئے نصیحت آمیز۔ اور وحدانیت اور حقّانیت سے لبریز اشعار اِس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جو شاعرانِ باکمال نے دُنیا کے روزانہ عبرت خیز واقعات کو دیکھ کر بڑے بڑے تلخ تجربوں اور عاقلوں کے اقوالِ زرّیں کو دینی اور دُنیاوی بھلائی کے لئے نظم فرمائے ہیں۔ اِس لئے کیوں نہ ہم اِن جواہر ریزوں کو اپنا معیارِ زندگی بنا کر سینکڑوں آفتوں۔ بلاؤں اور پریشانیوں سے اپنے کو بچائیں۔ اور اُن سے دینی اور دنیاوی فائدے اُٹھائیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دُنیا محض عارضی اور چند روزہ ہے اور اِس کی تمام چیزیں محض نمائشی اور دھوکہ کی ٹٹی ہیں ؎

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دیکے۔ بہلایا گیا ہوں

اِن چیزوں نے ہمیں اندھا بنا رکھا ہے۔ مقصودِ اصلی کے اور ہمارے درمیان ٹٹّی بن گئی ہیں۔ اگر یہ ٹٹیاں ہٹ جائیں۔ اور دل کی آنکھیں کُھل جائیں تو عالم ہی دوسرا نظر آئے۔ مئے گلگوں زہرِ قاتل معلوم ہو معشوقِ دلنواز دشمنِ ایمان اور مجسّم شیطان دکھائی دے۔ اور مطلبی دوست جیب کترے نظر آئیں۔ پھر تو اُس معشوقِ حقیقی کے جلوے کے سامنے سب کافور ہو جائیں ؎

پردے یہ غفلتوں کے اگر دل سے دور ہوں
مائل بہ صد سجود۔ سرِ پُر غرور ہوں ؎

اب میں ناظرین سے سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں

کہ اپنی عدم قابلیت کی بدولت ہیں لئے اس کتاب میں بہت کچھ غلطیاں کی ہوں گی تاہم میں اہلِ نظر اصحاب کے لطف و کرم کے بھروسے پر مطمئن ہوں کہ وہ ان فروگزاشتوں پر چیں بہ جبیں نہ ہوں گے بلکہ ان کے مقابلہ میں میری اس محنت کا زیادہ خیال فرمائیں گے جو کتاب کے محاسن میں صرف ہوئی ہے اور میری لغزشوں سے مجھے مطلع فرما کر ممنونِ احسان فرمائیں گے۔ نکتہ چین طبیعتوں سے امید ہے کہ وہ تلاشِ معائب کی جگہ جستجوئے محاسن میں سعی کریں گے

فرق آنکھوں میں نہیں۔ فرق ہے بینائی میں

عیب بیں عیب۔ ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

آخر میں عرض ہے چونکہ یہ کتاب بیشمار ذرائع سے تالیف کی گئی ہے۔ آراستہ کرنا میرا کام ضرور تھا لیکن جو اہراتِ آرائش و زیوراتِ زیبائش جن سے اس کتاب میں دلکشی اور جہاں فریبی پیدا ہو گئی ہے میری ملک نہیں وہ دوسرے باکمال اور فیاض طبع شعرائے شیریں مقال و نازک خیال کا گرانبہا عطیہ ہے جن کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا میرے لئے ناممکنات سے ہوگا اس لئے میں اُن تمام شعرائے ذی وقار۔ ایڈیٹرانِ رسائل و اخبار، مصنفین و مؤلفین ذوالاقتدار اور احبابِ نجستہ شعار کا شکریہ مجموعی طور پر ادا کرتا ہوں۔ جن کا اس کتاب۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور اس کتاب کی اشاعت سے ذرا سا بھی تعلق ہے خدا کرے وہ اس کو قبول فرما کر آئندہ بھی امداد فرما کر مزید شکر گزاری کا موقع دیں۔ والسّلام

دل شاد و بامراد رہیں مہرباں مرے
آباد حشر تک رہیں سب قدرداں مرے

اکتوبر ۱۹۳۵ء ناچیز عزیز الرحمٰن میر منشی قلعہ معلّے۔ کلاں محل دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمدِ باری تعالےٰ عزاسمہ

شوق لکھنوی

لکھ قلم پہلے حمدِ ربِّ ودود — کہ ہر اک جا پہ ہے۔ وہی موجود
ہمسر اُس کا نہیں۔ ندیم نہیں — سب ہیں حادث کوئی قدیم نہیں
ذاتِ معبود۔ جاودانی ہے — باقی جو کچھ بھی ہے۔ وہ فانی ہے

قوی امروہی

تو ہے خیال سے بلند۔ تیرا خیال ہو تو کیا — تیری صفت میں عقل کو۔ لافِ کمال ہو تو کیا
تیرا حریمِ ناز جب۔ اُونچا ہو لامکاں سے بھی — لاکھ بلند و تیز رو۔ مُرغِ خیال ہو تو کیا

امیر مینائی

حقا کہ دو جہاں میں ہے ذاتِ الٰہ ایک — دو آنکھیں جسطرح کہ ہے انمیں نگاہ ایک

مرزا دبیر لکھنوی

اے جلِّ شانہٗ وہ غفور الرحیم ہے — ہم سب ہیں درد مند۔ وہ کامل حکیم ہے
رحمٰن و مستعان و رؤف و حلیم ہے — اسکے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے
ایماں بھی دے۔ مُراد بھی دے عزّ و جاہ بھی
روزی بھی بخشے خُلد بھی۔ بخشے گناہ بھی

حالی پانی پتی

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا — ایک بندۂ نافرمان ہے۔ حمد سرا تیرا

" "

کامل ہے جو ازل سے۔ وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک۔ وہ ہے جلال تیرا

شفق عماد پوری

معراجِ بندگی ہے عجز و نیاز میرا — ہے شانِ کبریائی۔ کبر و غرور تیرا

میر درد دہلوی

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو۔ لوح و قلم کا

"

طرحِ اندازِ بنِ کون و مکاں تو ہی تو تھا — خوشنوائے حرفِ سازِ کن فکاں تو ہی تو تھا

نظیر اکبرآبادی

الٰہی تو فیاض ہے اور کریم — الٰہی تو غفار ہے۔ اور رحیم

"

مقدّس۔ معلّےٰ۔ منزّہ۔ عظیم — نہ تیرا شریک اور نہ تیرا سہیم

"

تری ذاتِ والا ہے یکتا قدیم

مناجات بدرگہہ قاضی الحاجات

(دیکھو رحم وکرم حصۂ دوم)

نہ کر عوض مرے جرم و گناہِ بیحد کا — الٰہی! تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں — وزیر لکھنوی

کہیں کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج — یہ اُس کا بندہ ہے جسکو کریم کہتے ہیں

درِ اغیار پر جھکنے نہ دے سر اپنے شیدا کا — نہیں دشوار کچھ تجھ کو۔ روا کرنا تمنّا کا — نامعلوم

ہجومِ غم سے اِن روزوں ہے دل زیرو زبر اپنا — بحقّ احمدِ مرسل۔ الٰہی فضل کر اپنا — اکبر الہ آبادی

سبکے دلمیں ہے جگہ تیری جو تُو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائیگا — غالب

خالقِ عالم تری کیا بات ہے — تو جہاں کا قاضی الحاجات ہے — صبی امروہی

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے — نہ میں بیزار دوزخ سے۔ نہ میں مشتاق جنت کا — مومن

کسی کا مجکو نہ محتاج رکھ زمانے میں — کمی ہے کونسی یارب ترے خزانے میں — داغ

کیا نہوگی میری ہی حاجت روا — جسکا مولےٰ قاضی الحاجات ہے — جوہر رامپوری

کیا مرے اِک دلکو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں — ایک کُن سے دو جہاں کو جسنے پیدا کر دیا — اکبر الہ آبادی

رباعی

عصیاں سے کبھی ہمنے کنارہ نہ کیا — پر تونے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہمنے تو جہنم کی بہت کی تدبیر — لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا — نامعلوم

ہے خوف اگرچہ جی میں۔ تو ہے تیرے غضب کا — اور دل میں بھروسا ہے۔ تو ہے تیرے کرم کا — میر درد

بھلوں کے بعد بُروں پر بھی ہو نگاہِ کرم — کہ تیرے بندوں میں پروردگار ہم بھی ہیں — نامعلوم

کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے — ترے آگے ہیں سب آساں۔ مرے آگے ہیں سب مشکل — حضرت شاہ...

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیوں کر — کہ ہے دستِ دُعا میں گوشۂ دامن اجابت کا — نامعلوم

عاصی ہوں میں تو ہے تری رحمت بھی بیحساب — انساں بنا کے اب مری مٹّی نہ کر خراب — ”

دنیا و دیں کے کاموں میں ہو جاؤں کامیاب — یارب دعا یہ میری تو کر جلد مستجاب — نامعلوم

ادعونی استجب لکم ارشاد ہے تیرا — ”

نعتِ رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم

وزیر لکھنوی

تجلّیِ نورِ ذات تو ہے۔ ظہورِ شانِ صفات تو ہی　　کمالِ رازِ وجود تو ہے۔ جمالِ سرِ حیات تو ہی
قسم خدا کی خدا نہیں ہو۔ مگر خدا سے جدا نہیں ہو　　نہ عینِ حق ہو۔ نہ غیرِ حق ہو۔ خلاصۂ کائنات تو ہی

میر تقی میر

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا　　دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسول کا
مطلوب ہے زمان و مکان و جہان سے　　محبوب ہے ملک کا۔ فلک کا عقول کا

قوی امروہی

قطعہ

جہاں میں بنکے احمد رونقِ عرشِ عظیم آیا　　دکھانیوالا بندوں کو صراطِ مستقیم آیا
زمانہ میں ہوا ہے غلغلہ سرور کی آمد کا　　رسولِ ہاشمی۔ محبوبِ خلّاقِ کریم آیا

مولانا ظفر علیخاں ایڈیٹر زمیندار

قطعہ

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو　　یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں۔ یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا۔ جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا　　وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

امیر مینائی

تمہیں سردارِ عالم یا محمد مصطفےٰ ٹھیرے　　قسیمِ حوضِ کوثر۔ شافعِ روزِ جزا ٹھیرے
رسولِ ہاشمی نبیوں میں ختم الانبیا ٹھیرے　　حسینوں میں حسیں ایسے کہ محبوبِ خدا ٹھیرے

جرأت

قطعہ

محمدؐ ہے نبی۔ ممدوح ذاتِ کبریائی کا　　کرے بندہ گر اسکی مدح۔ دعویٰ ہے خدائی کا
گروہِ انبیا میں وہ ہی حق کا برگزیدہ ہے　　سوا اس کے لقب کس کو ملا ہے مصطفائی کا

نامعلوم

محمدؐ سرِ قدرت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے　　شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

مولانا حالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا۔ ضعیفوں کا ماویٰ　　یتیموں کا والی۔ غریبوں کا مولا

اکبر الہ آبادی

رسولِ اکرم کی ہسٹری کو پڑھو تو اول سے تا بہ آخر　　وہ آپ ثابت کریگی اپنا عظیم ہونا عجیب ہونا

میر حسن دہلوی

نبی کون یعنی رسولِ کریم　　نبوّت کے دریا کا دُرِّ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب　　پر علمِ لدنی کھلا دل پہ سب

گیا جب زمیں سے سوئے فلک۔ تو وہ نور اُس کا جھلک جھلک
تھا نشاط بخش یہاں تلک۔ گیا جام عرش چھلک چھلک
لگے کہنے صلِّ علےٰ ملک۔ ہوا شہرہ اُن کا فلک فلک
بلغ العلیٰ بکمالہٖ۔ کشف الدجیٰ بجمالہٖ۔ حسنت جمیع خصالہٖ۔ صلّوا علیہ وآلہٖ

وہ صلواۃ بھیج احد صمد! جو ہو بے عدد نہ ہو جس کی حد
بحضور سیّدِ مستند۔ جو نبی ازل سے ہیں تا ابد
کریں لاکھ اہل حسد حسد۔ ہوا شہرہ ان کا بلد بلد
بلغ العلیٰ بکمالہٖ۔ کشف الدجیٰ بجمالہٖ۔ حسنت جمیع خصالہٖ۔ صلّوا علیہ وآلہٖ

اُمید و تمنائے شفاعت

خبر لینا بروزِ حشر۔ ختم المرسلیں میری ۔ شفاعت کرنا پیشِ حق شفیع المذنبیں میری ۔ صولت لکھنوی
غم ہے کیا جب دستگیر و حامی و شافع ہے تو ۔ مجھ سے عاجز مجھ سے بیکس۔ مجھ سی عصیاں کار کا ۔ اکبر میرٹھی
شافعِ محشر نہیں میرے گناہوں کا شمار ۔ ایسے عاصی پر تمہاری مہربانی چاہیئے ۔ ،،
مجھے اپنے گناہوں سے نہ ہو محشر میں رسوائی ۔ تمہارا ہوں شہِ والا۔ چھپانا مجھ کو دامن میں ۔ کوکب ناسک
صلِّ علےٰ محمدِ الشّافعِ الاُمَم ۔ دن حشر کے اٹھوں گا یہی میں پکارتا ۔ ضامن بیلوی
اے شافعِ محشر نہ کرے تو جو شفاعت ۔ پھر کون وہاں ترے سوا میرے لئے ہے ۔ جوہر رامپوری
محشر میں جب شفیع رسولِ انام ہو ۔ کیونکر نہ ہم پہ نارِ جہنم حرام ہو ۔ یوسف
اسکی اُمت میں ہوں میں۔ میرے رہیں کیوں کام بند ۔ واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا ۔ غالب
مخبرِ صادق ہو تم۔ اور حضرتِ خیرالوریٰ ۔ سرورِ ہر دو سرا اور شافعِ روزِ جزا ۔ نظیر اکبرآبادی
ہے تمہاری ذاتِ والا۔ منبعِ لطف و عطا ۔ کیا نظیرؔ اک اور بھی سب کی مدد کا آسرا ۔ ،،
یاں بھی تم اور واں بھی تم ہو یا محمدؐ مصطفےٰ ۔ ،،

اسرارِ قدرت

بسمل اللہ خاں بہادر اشفاق حسین ایم اے	گوشِ گُل میں تمنے کیا پھونکا کہ خنداں کردیا	کیا دکھایا چشمِ نرگس کو کہ حیراں کردیا
آتش	مطلب نہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر	دیوانہ ہو جو حالِ قضا و قدر کھُلے
احمدی کیجپوری	گلستاں ہیں گلوں کے کان ہیں آوازِ پا پر تیری	ترا ذکرِ خفی کرتا ہے ہر پتّہ زباں ہو کر
آتش	گُل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش	بلبل کا یہ نالہ نہیں۔ افسانہ ہے اُسکا
غالب	نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

احسان

اکبر الہ آبادی	یہ ہے کہ جھُکاتا ہے مخالف کی بھی گردن	سُن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بہتر
ذہین	احساں میں جب غرض ہو احسان ہی وہ کیا ہے	کیوں نام کی ہے خواہش کس کا نشاں رہا ہے
سالک (رباعی)	ابنائے زمانہ پہ جو کی خوب نگاہ	احسان اگر کریں تو سَو کرکے گواہ
	ہم سے بھی چھپا کر جو ہمیں دیتا ہے	سالک نہیں کوئی ایسا لیکن اللہ
جلیل	سچ ہے احساں کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے	چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری
جلال لکھنوی	جسنے کچھ احساں کیا۔ اک بوجھ ہم پر رکھدیا	سر سے تنکا کیا اُتارا۔ سر پہ چھپّر رکھدیا
نامعلوم	نیکی سدا کیا کر۔ اس کی بدی کے بدلے	قتلِ عدو کے قابل شمشیر ہے تو یہ ہے
شاد	کوئی گر سلطنت بھی دے تو واپس کر نہ لے ایذا	سبک ہر طرح تجھکو۔ غیر کا احسان کردیگا
	شاکر نہیں سَو بار جو احسان کرے	شاکی ہے جو احسان نہ اک آن کرے
نامعلوم	انسان جو اس طرح کا ہے تو انسان	احسان نہ تجھ پر کوئی انسان کرے
غالب	سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے	کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
نامعلوم	اور کوئی غرض ابنائے زمانے سے نہیں	مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اعمال

حق کو جو ناپسند ہو۔ تُف ایسے کام پر — مالک ہی خوش نہیں ہے۔ تو لعنت غلام پر — نامعلوم

عملِ نیک ہی وہ تخم کہ پھلتا ہے سدا — اسی دانے کو جو دانا ہیں وہ بو جاتے ہیں — حمید لکھنوی

آخرت میں عملِ نیک ہی کام آئیں گے — پیش ہے تجھ کو سفر۔ زادِ سفر پیدا کر — امیر مینائی

جو کچھ عذاب زیرِ زمیں ہو عجب نہیں — ساتھ اپنے گور میں بھی ہمارے عمل چلے — خواجہ آتش

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ — حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ — اکبر الٰہ آبادی

ق

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تری — وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں — نامعلوم

جس جا پہ تیرا ذکر ہو۔ ہو ذکر خیر ہی — اور نام تیرا لیں تو ادب سے لیا کریں

انساں کرے وہ بات۔ کہ اجر و جزا ملے — بندہ چلے وہ راہ کہ جس سے خدا ملے — ""

جہاں کہے جسے اچھا۔ وہی بشر اچھا — بُرا وہی ہے زمانہ جسے بُرا سمجھے — ثاقب شاہجہاں پوری

عمل جب تک نہ ہو اچھا بُرا پرکھا نہیں جاتا — یہی ہے وہ کسوٹی جو کھرے کھوٹے کو کستی ہے — نامعلوم

رباعی

وقت گزرا یہ بے مہر گزر جاتا ہے — انسان آتا ہے۔ آ کے مر جاتا ہے — ""

ہے زندۂ جاوید وہی نیک انجام — جو آن کے کچھ کام یہاں کر جاتا ہے — ""

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ ہے اعمال کی خوبی — مصیبت ہم پہ جب آئی تو آئی دل کے ہاتھوں سے — مائل دہلوی

سب ہے اعمالوں کا پھل شکوۂ صیاد نہیں — سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنا خدا یاد نہیں — نامعلوم

قطعہ

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت — کہ ہم کیونکر وہاں کا حال جانیں — اکبر الٰہ آبادی

لحد تک آپ کی تعظیم کر دی — اب آگے آپ کے اعمال جانیں

وہ عمل کیا جو دلیری کو گھٹائے اے دوست — قوتِ دل کو بڑھاتی رہے۔ وہ بات اچھی — نامعلوم

شاہراہِ ہستیٔ موہوم میں وہ چال چل — اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیرِ پا — آتش

نہ چھوڑ تو کسی حالت میں راستی۔ کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے — ذوق

اظہارِ مدعا

رند لکھنوی	عاشق کی اور فقیر کی صورت سوال ہے	مطلب سمجھ لیں آپ تو روشن ضمیر ہیں
قوی امروہی	پوچھتے کیا ہو۔ مدعا کیا ہے	خود سمجھ جاؤ۔ پوچھنا کیا ہے
بیخود دہلوی	تم سمجھ لو۔ سوچ لو۔ تم تاڑ لو۔ پہچان لو	بات اپنے دل کی ہم اپنی زباں سے کیوں کہیں
تسلیم فیض آبادی	ہیں عاشق اپنے مطلب کی کہیں گے	تمنا کیا ہماری۔ مدعا کیا
آتش لکھنوی	کیا کہوں آپ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے	حضرتِ دل جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں
غالب	میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں	کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
انشا	لیکے میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں	روکھی پھیکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی
صفدر رامپوری	ذرا بزم سے اٹھ کے خلوت میں سن لو	خدا جانے کیا مدعا ہے کسی کا
داغ	یوں بھی ہزاروں لاکھوں میں تم انتخاب ہو	پورا کرو سوال۔ تو پھر لاجواب ہو
بیدم اکبر آبادی	عرضِ مطلب پر بگڑ جاتے ہیں وہ	بات کہنا بھی شکایت ہو گئی
صابر حیدر آبادی	ایسے بچے نہیں کچھ۔ فضلِ خدا سے ہو جوان	آپ تو نام سے "بی شادی" کے ڈر جاتے ہیں
بیخود دہلوی	بلائیں لیکے پوچھا ہمنے انسے کہئے کیا سمجھے	وہ پہلے مسکرائے۔ پھر کہا تجھسے خدا سمجھے
شہرت	یوں بیٹھتے ہو۔ جیسے کسی سے کسی کو کچھ	مطلب نہیں۔ مراد نہیں۔ مدعا نہیں
حسرت موہانی	معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا	اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم
امیر مینائی	مانی ہیں ہم نے سینکڑوں باتیں تمام عمر	آج آپ ایک بات مری مان جائیے
آزاد انصاری	وہ کہتے ہیں اگر کوئی تمنا ہو تو ظاہر کر	خوشا قسمت کہ میرے منہ سے حرفِ مدعا نکلے
زار گوالیاری	ہجر میری موت ہے اور زندگی میری وصال	اب بتاؤ تم کو ان دونوں میں کیا منظور ہے
جلیل	درِ محبت کا اک گدا ہوں۔ پری کا طالب نہ حور کا ہوں	تجھی کو تجھ سے میں چاہتا ہوں۔ بس اور میرا سوال کیا ہے
نامعلوم	زباں سے حرفِ مطلب کہہ کے رسوا کیوں ہوں صاحب	سمجھنا ہو تو سمجھو شکل میری خود سوالی ہے

تم یہ کہتے ہو رہے پاسِ ادب لیکن یہاں — حرفِ مطلب کا زباں پر بار بار آنے کو ہے — نامعلوم

خامشی عرضِ حال ہے شاید — میری صورت سوال ہے شاید — نازؔ والیٔ خیرپور سندھ

کھڑا ہوں دیر سے میں عرضِ مدعا کیلئے — ادھر بھی ایک نظر کیجئے خدا کے لئے — نامعلوم

رہ نہ جائے خشک کشتِ آرزو — اس طرف بھی ابرِ رحمت دیکھنا — ”

عرض وہ عرض کہ جس عرض میں اصرار نہ ہو — بات وہ بات کہ جس بات میں انکار نہ ہو — ”

کیوں لبِ التجا کو دوں جنبش — تم نہ مانوگے اور نہ مانی ہے — ”

ہم فقیروں کو بھی کچھ حسن کی خیرات ملے — جن کو دیتا ہے خدا۔ راہِ خدا دیتے ہیں — ”

پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف — امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے — منیرؔ شکوہ آبادی

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی — سودا

اظہارِ مدعا کا ارادہ تھا آج کچھ — تیور تمہارے دیکھ کے خاموش ہو گئے — نامعلوم

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے — آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے — ”

گزر اس وقت ہوا ہے بہر مدفن اُن کا — اب تو اے دستِ طلب چھوڑ نہ دامن انکا — مضطر خیرآبادی

دستِ نازک سے مئے ناب کے چھینٹے دیکر — میری سوئی ہوئی قسمت کو جگا دی ساقی — فخری پانی پتی

اتفاق (دیکھو اخلاق)

رباعی

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کی عوض خیر کریں — مولانا حالی

جو کہتے ہیں یہ۔ کہ ہے جہنم دنیا — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

بدسلوکی میں مزہ کیا ہے مزہ ہے اسمیں — کہ ہمارا ہو تمہیں۔ پاس تمہارا ہم کو — داغ

آپسمیں موافق رہو۔ طاقت ہے تو یہ ہے — دیکھو نہ بہم عیب۔ محبت ہے تو یہ ہے — اکبر الٰہ آبادی

صحت بھی ہو روزی بھی ہو۔ دلکو بھی ہو تسکین — دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

آپسمیں رہنا صلح سے خوئے بنی آدم نہیں — اکثر اسی پر ہے عمل۔ یا تم نہیں یا ہم نہیں — ”

آرزو۔ ارمان۔ حسرت۔ تمنّا

اکبر الٰہ آبادی	ناک رگڑی برسوں اس ارمان میں	سن لیں میری بات اک دن کان میں
״	سینہ سے لگائیں تمہیں ارمان یہی ہے	جینے کا مزا ہے تو میری جان یہی ہے
״	کیا وہ خواہش کہ جسے دل بھی سمجھتا ہو حقیر	آرزو وہ ہے جو سینہ میں رہے ناز کے ساتھ
تسلیم لکھنوی	تھی تمنّا باغِ عالم میں گُل و بُلبل کی طرح	بیٹھ کر ہم تم کہیں اے یار ہنستے بولتے
بیخود دہلوی	کافر ہوا اگر وصل کا ارمان ہو دل میں	مجھ کو تو فقط دیکھنی تھی بات کسی کی
داغ	اتنی غرض ہے گردشِ لیل و نہار سے	راتیں ہوں وصلِ یار کی دن ہوں بہار کے
مسٹر اقبال	محفل ہو شغلِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو	اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی
دولہا	ابر ہو۔ دریا ہو۔ خلوت ہو۔ بُتِ بے پیر ہو	تب کہیں حاصل۔ مرادِ عاشقِ دلگیر ہو
جلال لکھنوی	اِک رات دل جلوں کو یہ عیشِ وصال دے	پھر چاہے آسمان جہنم میں ڈال دے
ہوس	لُطفِ شبِ مہ اے دل اس دم تجھے حاصل ہووے	اک چاند بغل میں ہو اک چاند مقابل ہووے
امیر مینائی	جنّت کا نہ میں خواہاں حوروں کا نہ میں طالب	بوٹا سا وہ قد ہوتا چھوٹا سا مکاں ہوتا
حسن	لپٹ جاؤ آ کر گلے سے ہمارے	یہی ہے تمنّا۔ یہی مدّعا ہے
	رباعی	
آتش	ساقی ہو اور مے ہو۔ ساغر ہو اور سبو ہو	سبزہ ہو اور جُو ہو۔ اور یار رو برو ہو
	آتش جو میری قسمت یہ دن مجھے دکھا دے	کافر ہوں پھر جو مجھکو کچھ اور آرزو ہو
میر سوز	سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے	مرنا تو مسلّم ہے۔ ارمان نکل جائے
حسن بھوپال	یہی بس آرزوئے دل تھی ہمنے بھر پایا	کسی کا ہائے یہ کہنا کہ تیری آرزو کیا ہے
خنجر	وہ بھی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی اُمید	وہ بھی دن ہوگا۔ کہ کوئی مرا مہماں ہوگا
زار گوالیاری	پیار کے التفات کے بوسہ کے ہم خواہاں نہیں	وہ سمجھتے ہیں ہماری آرزو کچھ اور ہے
امیر مینائی	پاکدامن ہو تو۔ ارمانِ وصال اچھا ہے	اچھّی نیت ہو تو اچھوں کا خیال اچھا ہے

ارمان نہ ہو تو انسان پریشان نہ ہو

تمنّا جو نہ رکھتا ہو۔ جھکائے وہ نظر کس سے	اُسے شادی و غم کس کا۔ اُسے سُود و ضرر کس سے	تصویر دہلوی
کچھ یاس سے تسکینِ دلِ مضطر کو ہوئی تھی	پھر چھیڑ دیا ہائے تمنّا کا بُرا ہو	نامعلوم
خواہشیں دنیا کی بارِ دوش و گردن ہو گئیں	رفتہ رفتہ منزلِ عقبیٰ کی رہزن ہو گئیں	اوج ابن زبیر
دولت کی ہوس۔ اصل گدائی ہے یہ	ساماں کی حرص۔ بینوائی ہے یہ	
حاجت ہو کم۔ تو ہے یہ شاہنشاہی رباعی	اور کچھ نہ ہو حاجت۔ تو خدائی ہے یہ	حالی
ہے پریشانی کا باعث میلِ مال و حُبِّ جاہ	وجہِ اطمینانِ دل ہے۔ رغبتِ صوم و صلوٰۃ	نامعلوم
جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی	ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے	میر تقی
ہم خدا تھے۔ گر نہ ہوتا دل میں کوئی مُدّعا	آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا	شمس میرٹھی
تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں	کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں	شاد
بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے	ناامیدی ہو۔ تو پھر آرام کی امید ہے	ذوق
ہے حصولِ آرزو کی وجہ ترکِ آرزو	میں نے دُنیا چھوڑ دی۔ تو مل گئی دنیا مجھے	سیماب اکبر آبادی
بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی	ترکِ خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا	اکبر الٰہ آبادی
تمنّائے ترکِ تمنّا ہے باقی	یہ کیونکر کہوں کچھ تمنّا نہیں ہے	نازو والیٔ خیرپور سندھ
درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے	درگزریں دعا سے بھی۔ دعا ہے یہ خدا سے	حالی
موت مانگی تھی۔ خدائی تو نہیں مانگی تھی	لے دعا کر چکے۔ اب ترکِ دعا کرتے ہیں	یاس
سراسر آرزو کرنے نے بندہ کر دیا ہم کو	وگرنہ ہم خدا تھے۔ گر دلِ بے مُدّعا رکھتے	نامعلوم
پہلے تھیں ایسی دو رہت دل میں حسرتیں	اب آرزو یہ ہے۔ کہ کوئی آرزو نہ ہو	قوی امروہی
کیا ہم نے تو ترکِ مُدّعا کو مُدّعا اپنا	خدا توفیق بخشے نیک چرخِ سفلہ پرور کو	لُطف اسطرآبادی
مایوسیٔ وصال ہے وجہِ سکونِ دل	اُلفت نہ ہو کسی سے تو دردِ جگر نہ ہو	نامعلوم

اظہارِ عشق و اُلفت

(دیکھو راز و نیاز حصہ دوم)

شہیدی
جان اب تم سے ہے کیا بھید چھپانا دل کا
آپ سے مجھ کو مبارک ہو لگانا دل کا

اکبر الہ آبادی
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے
پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

ہمدم اکبر آبادی
خواہش پری کی ہے نہ تمنا ہے حور کی
آنکھوں کے آگے بس رہی ہے صورت حضور کی

نامعلوم
ان آنکھوں کو ہے بس رخِ پر نور سے مطلب
کوٹھے سے حسینوں کے۔ نہ کچھ طور سے مطلب

جوہر فرخ آبادی
تکلف کے یہ معنی ہیں سمجھ تو بے کہے دل کی
مزا کیا جب ہمیں نے یہ کہا تم سے کہ مرتے ہیں

قمر
تمہیں پر تو صدقہ یہ جاں ہو رہی ہے
تمہیں پر تو یہ دل۔ فدا ہو رہا ہے

مس گوہر کلکتہ
جب سے ہوا ہے مجھ کو ترا عشق ماہ رو
اک آگ سی جگر کے ہے اندر لگی ہوئی

نامعلوم
پوچھتے کیا ہو کہ تم کو دل دیا کیا دیکھ کر
خوبصورت دیکھ کر۔ لاکھوں میں یکتا دیکھ کر

داغ
اِدھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں
تجھی پر تو دل آ گیا ہے کسی کا

نامعلوم
ہوئی جب سے اے یار اُلفت تمہاری
اِن آنکھوں میں پھرتی ہے صورت تمہاری

آتش
اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اُسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

بینظیر وارثی
ستم دیکھ کر یا کرم دیکھ کر
غرض مر مٹے کچھ تو ہم دیکھ کر

داغ
تیرے سوا کسی سے محبت صنم نہیں
تیری قسم نہیں ہے۔ خدا کی قسم نہیں

حسن بریلوی
پوچھتے کیا ہو کہ دل میں کون ہے
لو یہ آئینہ اُٹھا کر دیکھ لو

تسلیم لکھنوی
نہ پوچھو کس پہ مرتا ہوں یہ منہ پھیرے جو بیٹھے ہیں
اِنہیں پر جان جاتی ہو۔ اِنہیں پر دم نکلتا ہے

نامعلوم
ہر چند عرضِ حال کی جُرأت نہیں مجھے
یہ تو نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں مجھے

رسا
سو بار صدقہ ہو کے بھی یہ چاہتا ہے جی
سو بار اور آپ کے قربان جائیے

اکبر الہ آبادی
خدا کے ہوتے بتوں کو پُوجوں۔ نہیں تھا مطلق گمان ایسا
مگر تمہیں دیکھ کر تو واللہ۔ آ چلا مجھ کو دھیان ایسا

اِظہارِ عشق نہ کرنا چاہیے

غلط ہے کہ دل کا لگانا بُرا ہے ۔	محبّت کا لیکن جتانا بُرا ہے	رونق
حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا	کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا	حسرت موہانی
اُلفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا	بیخود تمہاری عقل کے قربان جائیے	بیخود دہلوی
دل کی لگی کا حال کہا بھی تو کیا لیا	ظالم کو اور جان کا دشمن بنا لیا	افسر امروہی
کھنچتے ہو ہم سے دُور۔ ہمارا قصور ہے	کیوں چاند تم کو کہہ کے فلک پر چڑھا دیا	خلیل
کس کس طرح سے اُس کو جلاتے ہیں رات دن	وہ جانتے ہیں داغ ہے ہم پر مٹا ہوا	داغ
جذبِ اُلفت تیرے صدقہ شوقِ دل تجھ پر نثار	اور وہ کھنچنے لگے مائل طبیعت دیکھ کر	حلم بریلوی
کر کے اظہار بے کلی دل کی	بات کھو دی رہی سہی دل کی	نامعلوم
جو عیشِ بے خلل منظور ہے دشتِ محبت میں	نہ کرنا یار کے آگے کبھی اظہار اُلفت کا	״
خوشامد سے بگاڑا آپ ہم نے اس کی عادت کو	بنایا اپنا دشمن خود جتا کر منہ سے الفت کو	״
گر گدھی کے کان میں کہہ دوں کہ ہوں تجھ پر فدا	ہے یقیں مجھ کو کہ وہ بھی کھیت کھانا چھوڑ دے	״

آنکھیں ہوئیں چار۔ دل میں آیا پیار

تھی خطا اُن کی مگر جب آ گئے وہ سامنے	جھک گئیں میری ہی آنکھیں رسمِ اُلفت دیکھئے	نامعلوم
دیکھتے ہی اُنہیں وہ حال نہ تھا	مجھ کو گویا کبھی ملال نہ تھا	״
وہ آ کے دفعتاً جو ہم آغوش ہو گئے	جتنے گلے تھے دل میں فراموش ہو گئے	״
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم	بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری	داغ
آئے تھے اُن سے کہنے۔ اُن کے ستم کا قصہ	اِس کا علاج کیا ہے۔ اب پیار آ رہا ہے	رسا رامپوری
آ جائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے	عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط	ناظم والیٔ رامپور

آئینہ - آرسی

قوی امروہی	کیا غور سے اے جانِ جہاں دیکھ رہے ہو	تم سا کوئی - آئینہ کے اندر تو نہیں ہے
بیخود دہلوی	نہ دیکھنا کبھی آئینہ بھول کر دیکھو	تمہارے حُسن کا پیدا جواب کر دیگا
قیصر ،،	اپنی صورت آئینہ میں تم نہ دیکھو ہر گھڑی	کر دیا دیکھو - اسی صورت نے دیوانہ ہمیں
وصال ،،	آئینہ گھورنے کو سب سے نرالا نکلا	منہ تو دیکھو - یہ بڑا چاہنے والا نکلا
ریاض گورکھپوری	لئے بیٹھے رہو اپنے لئے تم آرسی اپنی	خوشامد خوری پُمنہ دیکھی - ہماری دیکھی بھالی ہے
ذاکر دہلوی	ہم نہ کہتے تھے - نہ دیکھو آئینہ - یہ کیا ہوا	کسلئے ششدر رہوئے - کیوں تمکو سکتا ہوگیا
امیر مینائی	تکا کرتی ہے چاند سا مُنہ کسی کا	ستارہ ہے چمکا ہوا آرسی کا
جلیل مانکپوری	نظر اُٹھائیں جو آرسی سے تو اُنسے پوچھوں یہ میں ہنسی سے	لگائی ہے آنکھ کیا کسی سے کہو تو یہ دیکھ بھال کیا ہے
غالب	آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
میر تقی	نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے	نہیں ہے اعتبار اسکا - یہ مُنہ دیکھے کی اُلفت ہے
نظام رامپوری	انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ	اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہو
نسیم دہلوی	آئینہ بنکر رہوں ہر وقت پیشِ روئے دوست	وہ مجھے دیکھا کرے دیکھا کروں میں سوئے دوست
بہادر بیگ خاں غالب دہلوی	رہتے ہیں آئینہ سے ہمیشہ دوچار آپ	تنہا ہی لوٹتے ہیں یہ ساری بہار آپ
منظر امروہی	میں ہی نہیں فریفتہ روئے نگار دیکھ کر	خود ہیں وہ محوِ آئینہ - اپنی بہار دیکھ کر
داغ	آئینہ مُنہ پہ بُرا اور بھلا کہتا ہے	سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے
بیخود دہلوی	آئینہ کیا بتائے گا مجھ سے ملاؤ آنکھ	میری نظر کسوٹی ہے حُسن و جمال کی
نامعلوم	بُتِ طناز آئینہ سے یہ خوش فعلیاں کب تک	اِدھر بھی اک نظر او اپنی صورت دیکھنے والے
مفتون دہلوی	دیکھ کر آئینہ کو عکس سے کہتا ہے وہ شوخ	کچھ اگر حُسن کا دعوے ہے تو باہر آؤ
،،	بن ٹھن چکے لبس آئینہ کے پاس سے سرکو	اب آرسی ہیں ٹھیک کرو گورکسر کو

آہ

دیکھنا کیا مرتبہ ہے عاشقوں کی آہ کا — اوّل و آخر میں جس کے حرف ہے اللہ کا — نسیم دہلوی
عشق کے مکتب میں میری آج بسم اللہ ہے — مُنہ سے کہتا ہوں الف دل سے نکلتی آہ ہے — کلثوم زمانی دہلوی
وہ تو کہتا ہے ستم ہے ہم اُدھر دیکھیں تو — چل تو اے آہِ رسا۔ تیرا اثر دیکھیں تو — شہرت دہلوی
نہ تھی تاب اے دل تو کیوں چاہ کی — بڑا تیر مارا اگر آہ کی — داغ
کھینچنا اُلفت میں دل سے آہ کا اچھا تو ہے — لگ گیا تو تیر اے ظالم نہیں تُکّا تو ہے — شاہ ظفر
ہے اثر سے کوئی کاوش نالۂ شبگیر کو — کچھ عداوت ہو گئی ہے آہ سے تاثیر کو — صبی امروہی
آہ ہوتی مرے لب پر۔ نہ یہ نالہ ہوتا — ایک بھی تو نے جو ارمان نکالا ہوتا — رسا
سینہ پھٹتا ہے جو روکوں نالۂ جانکاہ کو — آسماں جلتا ہے گر مُنہ سے نکالوں آہ کو — مخمور لکھنوی
عشق میں نے سیم نہ زر چاہیے — آہ میں کچھ اپنی اثر چاہیے — نامعلوم
آہ سے مظلوم کی ڈر ظالمِ نخوت پرست — سامنے جس کے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں — ذہین
آہِ پُر درد سے بچتے رہیں کہہ دو اُن سے — جو ہنسی کھیل سمجھتے ہیں دُکھانا دل کا — یوسف صادقی
مجھے جلا کے رہیں گے نہ آپ بھی ٹھنڈے — کہ آہِ سوختہ جاں بے اثر نہیں ہوتی — قوی امروہی
دو ہی آہوں میں نہ خوں ہو کے کلیجہ بہ جائے — دیکھ بلبل مرے نالوں کی روش یاد نہ کر — اکبر
کب تک یہ طولِ فرقت تاثیر دے الٰہی — اس آہ نارسا کو اس اشکِ بے اثر کو — نامعلوم
سُن کے میری آہ شب کو وہ مری گھر آ گئے — ہنس کے پوچھا کچھ ابھی باقی اثر ہونے کو ہے — کیف
رات تہ صبح تک اے رشکِ قمر دیکھیں گے — آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے — اشک
آہ نکلی ہی تھی ہونٹوں سے کہ وہ آ پہونچے — دیکھ لی میری دُعاؤں نے اثر کی صورت — ذاکر دہلوی
میری آہ کا تم اثر دیکھ لینا — وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھ لینا — داغ
چرخ کو چکّر زمیں کو زلزلہ۔ لرزاں ہیں کوہ — خوف میری آہِ سوزاں سے تمہیں لیکن نہیں — آسف حضرت بہوری

انتظار

ذہین
ہو اگر کچھ یار کے تشریف فرمانے میں دیر
تو کریں کاہیکو ابن دنیا سے ہم جانے میں دیر

اکبر میرٹھی
کیا نہوگا آج بھی وعدہ وفا او حیلہ ساز
کیا تڑپتے ہی تڑپتے رات بھر ہو جائیگی

نامعلوم
اے ابر بہار آج ذرا تھم کے برسنا
آجائے مرا یار تو پھر جھم کے برسنا

″
کہتے ہیں آنے کو وہ آئیں نہ آئیں دیکھئے
شوق میں کبتک مجھے رستہ دکھائیں دیکھئے

″
تھک گئے ہم کرتے کرتے انتظار
اِک قیامت اُن کا آنا ہو گیا

″
قاصد اگر وہ پوچھیں تو کہدیجیو یہ حال
لب پر تو دم ہے. آنکھ ہے در پر لگی ہوئی

یاس عظیم آبادی
دھوم سُنتا رہا اب آتے ہیں اب آتے ہیں
حشر تک میں یونہی کھولے ہوئے آغوش رہا

نامعلوم
آئیگی کس کے لئے دل امید کر رہا ہے
جھوٹا زمانہ بھر کا وہ ایک چالیا ہے

آتش
وعدہ خلاف یار سے کہیو پیام بر
آنکھوں کو روگ دے گئے کیوں انتظار کا

رنجور عظیم آبادی
انتظار اُن کا عبث اے دلِ مشتاق نکر
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

عارف لکھنوی
وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے
میں گُل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

مومن دہلوی
ہے کسکا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

ہمدم اکبر آبادی
نہ پوچھو کچھ شبِ وعدہ بلا کی انتظاری ہے
صدا پر کان، در پر آنکھ دل میں بیقراری ہے

زیب
شبِ وعدہ یہ رہا کرتی ہیں باتیں دل سے
دیکھیں یار آتا ہے پہلے کہ قضا آتی ہے

داغ
غضب کیا ترے وعدہ پر اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

″
نہ جانا کہ دُنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

نامعلوم
رگ رگ تڑپ رہی ہے کہ بنجاؤں چشمِ شوق
بیٹھا ہوں گو خموش ترے انتظار میں

حسن شاہجہانپوری
آجا کہیں شتاب کہ مانندِ نقشِ پا
تکتے ہیں راہ تیری سرِ رہ پڑے ہوئے

نامعلوم
کیا جانے روزِ حشر کو کُھلتی نہ کُھلتی آنکھ
اچھا ہوا اُڑا دی جو نیند انتظار نے

آمدِ یار

لو وہ آئے جانِ عاشق پر غضب ڈھاتے ہوئے	مُسکراتے اینڈتے جوبن پہ اتراتے ہوئے	آزاد
آج دم بھر میں اجل کا سامنا ہونے کو تھا	خیر گزری آگئے تم کیا سے کیا ہونیکو تھا	تسلیم لکھنوی
دم لبوں پر تھا دلِ زار کے گھبرانے سے	آگئی جان میں جان آپ کے آجانے سے	اکبرالٰہ آبادی
لو جی گئے جو آکے کہا تم لئے مر کہیں	اچھی گھڑی کے کوسنے ہم کو دُعا ہوئے	جلال لکھنوی
بڑی راہ دکھلائی حضرت سلامت	بھلے سے حضور اب بھی تشریف لائے	نامعلوم
پوچھا کیا ہے ترے آنے سے کیا کیا ہو گیا	ہاتھ بھر دل بڑھ گیا دُگنا کلیجہ ہو گیا	سائل دہلوی
قدم رنجہ فرمائیے بے تکلّف	سرِ رہ ہم آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں	حشمت
بجلیاں دیکھنے والوں پہ گراتے آئے	تم جدھر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے	رسا
او وعدہ فراموش کدھر بھول پڑا آج	تقدیر ہماری ۔ جو یہ صورت نظر آئی	روشن
غصّہ آتا ہے ۔ پیار آتا ہے	غیر کے گھر سے یار آتا ہے	رشکی دہلوی
یار تنہا جو ادھر بھول کے آنکلا ہے	کیسے ارمان مچلتے ہیں نکلنے کے لئے	قوی امروہی
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں	غالب
وہ چھپکے آئے ہیں ڈرتے ہوئے ہمارے گھر	رقیب کو نہ خدایا خبر کرے کوئی	داغ
مدّ نظر ہے خاطرِ مہماں نگاہ میں	آنکھوں کا فرش میں نے بچھایا ہے راہ میں	نامعلوم
ذاکر کے در پہ آکے وہ کہتے ہیں ناز سے	اس خانماں خراب کو جب دیکھو گھر نہیں	ذاکر دہلوی
الفت اِسے کہتے ہیں یہ جذبِ محبّت ہے	بے آئے مرے گھر میں تو رہ نہ سکا دیکھا	بیخود دہلوی
نالہ شبِ فراق میں کب رائگاں گیا	کیوں آپ آئے اب وہ تنفر کہاں گیا	حضور
یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے	کفن میں کھولدیں آنکھیں سُنا جو یار آیا	تجلّی دہلوی
جلوہ فرمائی کا مژدہ کس نے بھیجا ہے کہ آج	دیدہ و دل ہمدگر صرفِ مبارک باد ہیں	عیش

افلاس۔تنگدستی۔فاقہ مستی

اکبر الہ آبادی
ہو کے مقروضِ مغاں کی ترک ہم نے میکشی
تنگدستی کا بھلا ہو پارسا ہونے لگے

ریاض گورکھپوری
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

استاد ذوق
چاہیئے زر۔ اِن بتانِ سیم تن کیواسطے
ہم قلندر ریاں نہیں کوڑی کفن کیواسطے

امیر مینائی
ممکن ہے بے زری میں مَیں صبر ای خدا کروں
فرمائشیں جو یار کرے اس کو کیا کروں

جوش ابن میر تقی
دنیا میں فکرِ نان ہے عدم میں عذاب ہے
ہر طرح سے غریب کی مٹی خراب ہے

اکبر الہ آبادی
خُلق انکو کو سب نے خوشامد سمجھ لیا
کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب آدمی کے ساتھ

راسخ
راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

غالب
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایکدن

"
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

"
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

نامعلوم
تنگدستی کے سبب جان سے بیزار ہیں ہم
دار پر کھینچ دے اے چرخ کہ نادار ہیں ہم

داغ
اُن کی فرمائش نئی دن رات ہے
اور تھوڑی سی مری اوقات ہے

قیصر دہلوی
کافر ہوں گر سہارا کفن کا بھی ہو ہمیں
مرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں اب مفلسی سے ہم

ولی گجراتی
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

نامعلوم
جی تک بھی اگر چاہو تو وسواس نہیں ہے
کچھ اور جو ڈھونڈھو تو مرے پاس نہیں ہے

وحشی
کوئی مفلس سے ہائے یہ پوچھے
تو نے دنیا میں آکے کیا دیکھا

اکبر الہ آبادی
بے سُود اشعار اور کبت ہوتے ہیں
مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
گر پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار
رباعی
یہ بُت تو بزورِ زر ہی چت ہوتے ہیں

رعنا
وہ سب بدمستیاں تھیں زر کی اب ہم نہ پیتے ہیں
ہماری مفلسی خود راہ پر ہم کو لگا لائی

اللہ سے مانگو۔ ماسوا سے نہیں

خدا سے مانگ اے دل شرم کر بندوں کی ہمت سے　　جو حاجت مند ہے ہر دم وہ کیا حاجت روا ہوگا

کیوں نہ ہم ہوں ملتجی اپنے خدا کے سامنے　　عرضِ حاجت چاہیئے حاجت روا کے سامنے

جو چاہتا ہوں مانگتا ہوں اپنے خدا سے　　سائل سے کسی چیز کا سائل نہیں ہوتا

خدا ہی ہے نہیں اُس کے سوا حاجت روا کوئی　　خلاف سکے جو ہو مشرک ہے میں تم ہو یا کوئی

دلمیں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے　　کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

کرتے ہو تم خوشامدِ دُنیا بڑھا کے ہاتھ　　اللہ کی طرف نہیں اُٹھتے دعا کے ہاتھ

چشمِ کرم بشر سے ذلّت کا سامنا ہے　　اللہ سے طلب کر جو تجھ کو مانگنا ہے

ہوتی ہیں حاجتیں روا۔ کس سے کریم کے سوا　　کہتے ہیں حرص آشنا۔ غیر سے التجا عبث

شرم کی جا ہے بشر کچھ جو بشر سے مانگے　　کسی گلشن میں نہیں طالبِ زر پھول سے پھول

اگر سچ پوچھئے اس سے کہیں آسان ہے مرنا　　غیور انسان کا نا اہل سے حاجت طلب کرنا

تنگ دستی کے جو ہاتھوں سے میں گھبراتا ہوں　　اور درِ غیر پہ جاتا ہوا شرماتا ہوں

ہاتھ پھیلانے سے محتاج کو غیرت کیا ہے　　شرم اسکی ہے کہ بندہ ترا کہلاتا ہوں

تمہیں جو مانگنا ہے لے رسا اللہ سے مانگو　　بڑی سرکار ہے اُسکی۔ بڑا وہ دینے والا ہے

وہ عجب در ہے کہ مانگے نہیں عزت جاتی　　اپنے اللہ سے ہر ایک سوال اچھا ہے

رباعی

ہوں خالقِ بحر و بر کا۔ ہر اک کا نہیں　　وابستہ ہوں اِک در کا۔ ہر اک کا نہیں

کیوں غیرِ خدا سے اپنی حاجت چاہوں　　بندہ ہوں میں اک ہر کا۔ ہر اِک کا نہیں

مُردوں سے نہ زندہ دل سے نہ فقرا و غنی سے　　سالک سے نہ مجذوب سے نے شیخ و ولی سے

نادان ہیں امید جو رکھتے ہیں کسی سے　　تکیہ فقط اللہ پر ہم رکھتے ہیں جی سے

جُز ذاتِ خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اقرار۔ وعدہ۔ قول و قسم۔ عہد و پیمان۔ وعدہ خلافی۔ بے اعتباری

صبا لکھنوی
طالبِ وصل سے تم آج بھی جھگڑا لائے
پھر وہی کل کی طرح وعدۂ فردا لائے

حیا دہلوی
اک بات پوچھتا ہوں اگر تم خفا نہ ہو
انسان کیا جو وعدہ کرے اور وفا نہ ہو

نازو الٰی خیرپور سندھ
وعدہ کرتے ہو تو وہ کرنا کہ جو جھوٹا نہ ہو
وہ قسم تم آج کھاؤ جو نہ ہو کھائی ہوئی

انور لکھنوی
وعدہ تو کر دیا یہ خیالِ وفا بھی ہے
دینے کو کہتے ہیں۔ کوئی بوسہ دیا بھی ہے

مرید دہلوی
تھا وعدہ سرِ شام کا پھر اب ہے سحر کا
ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہ ہووے

امیر مینائی
ہو چکا وعدہ کہ کل آئیے گا
دیکھئے اب نہ بدل جائیے گا

نامعلوم
جاتے ہو کس جگہ کو مری جاں چھڑا کے ہاتھ
وعدہ بھی کچھ کیا تھا۔ کسی سے ملا کے ہاتھ

بینظیر وارثی
وہ میرا سوال اور آنکھوں میں آنسو
وہ گھبرا کے منظور کہنا کسی کا

تصویر دہلوی
کہتے ہو فرصت ہوئی تو ہم آئیں گے ضرور
میری جاں یہ بھی کوئی انداز ہے اقرار کا

داغ
تو نے آج او بیوفا کیا جاتی دنیا دیکھ لی
راہ پر آنے لگا عہدِ وفا ہونے لگے

〃
باہم اک وعدۂ فردا پہ نوشتہ ہو جائے
کہ مری سہو کی عادت ہے مجھے یاد رہے

〃
میری باتوں کا نہ باور ہو نوشتہ لیلو
شاہد انساں کے عوض چاہے فرشتہ لیلو

اکبر میرٹھی
لئے وعدے ہزاروں اُنسے ہمنے اس تمنّا پر
کہ صد ہا جھوٹ میں اک آدھ سچا ہو ہی جاتا ہے

مصحفی
ہیں وہ نہیں ہم کہ اس بُت سے دل مرا پھر جائے
پھروں ہیں اُس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

داغ
میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ بات ہے کیا
وعدہ وہ کرتے ہیں۔ آتا ہے تبسم مجھ کو

رسا
دے کر مجھے تسلی بے چین کر رہے ہو
ہنستے ہو وعدہ کر کے قربان اس ہنسی کے

تسلیم
کہہ دیا ہر بات پر ہاں ہاں اگر کچھ بھی نہیں
میں نے جو درخواست کی منظور ہو کر رہ گئی

واصف
مزے سے اپنے گھر بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں
قیامت ہے کہ وعدے ہیں نہ آتے ہیں نہ جاتے ہیں

قیصر دہلوی
صاف انکار اگر ہو تو تسلی ہو جائے
جھوٹے وعدوں سے ترے رنج سوا ہوتا ہے

خدا چاہے تو آئیں گے عبث کہتے ہو وعدوں پہ	ہمیں معلوم ہے صاحب خدا چاہے نہ تم چاہو	راسخ
کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری برسوں	ہوئے برسوں نہ ہوئی پر وہ تمہاری برسوں	استاد ذوق
مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے	ہزاروں دیکھیے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں	''
یاد آیا یاں کے آنیکا وعدہ اُنہیں تو کب	جب ہات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے	''
یہی ہے وہ زباں جس سے کیا تھا وصل کا وعدہ	اسی مُنہ سے کہا تھا ہم ملیں گے باوفا ہو کر	دبیر از رڑکی
کھا جائیں فریب ایسے تو ناداں نہیں ہم بھی	وعدہ بھی غلط آپ کا۔ جھوٹی ہے قسم بھی	بیخود دہلوی
ہزاروں خوبیوں کے ساتھ تجھ میں یہ برائی ہے	ترے وعدوں کو جھوٹا ہم نے ظالم بیشتر پایا	''
وعدۂ وصل میں انکار کا پہلو ہے عیاں	ڈگمگاتا ہے جہاز اب لبِ ساحل میرا	ذاکر دہلوی
در پہ رہنے کو کہا۔ اور کہہ کے کیسا پھر گیا	جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا	غالب
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب	یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں	''
آپ کی قسموں کا اور مجھکو یقیں	ایک بھی وعدہ کبھی پورا کیا	شوخ امروہی
میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں	اسے کیا کروں۔ کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا	امیر مینائی
نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے	نہ کھا قسم ارے جھوٹے۔ کبھی جو تو آئے	ریاض گورکھپوری
تم لاکھ قسم کھاتے ہو ملنے کی عدو سے	ایمان سے کہہ دوں مجھے باور نہیں آتا	امیر مینائی
یوں تو وہ روز کیا کرتے ہیں اقرار وفا	وقت آتا ہے تو پھر صاف مکر جاتے ہیں	سرادہ بیگم صاحبہ سالارہ بھوپال
کم سنی میں تو حسیں عہدِ وفا کرتے ہیں	بھول جاتے ہیں مگر سب۔ جو شباب آتا ہے	انور از بمبئی
عہد و پیماں کا تمہارے کیوں کروں میں اعتبار	کیا مرے سر کی کبھی جھوٹی قسم کھائی نہ تھی	قوی امروہی
آپ کا اعتبار کون کرے	روز کا انتظار کون کرے	داغ
یقین ہے مجھ کو وعدیکا نہ کھائیے آپ اب قسمیں	عنایت ہے کرم ہے بندہ پرور مہربانی ہے	قیصر دہلوی
اقرار کر کے گھورتے ہو کیوں مری طرف	باور سہی۔ یقین سہی۔ دل نشیں سہی	داغ
وفائے وعدہ سے چشم پوشی ہمیشہ شام و پگاہ کرنا	حضور نے کیا ثواب سمجھا ہے منتظر کو تباہ کرنا	اکبر الہ آبادی

انکار

امیر مینائی	دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں	رہ گئی ایک نہیں "ہاں" کا کہیں نام نہیں
بیخود دہلوی	جھوٹا ہی کیوں نہ کیجئے وعدہ تو منہ سے کیجئے	انکار سُنتے سنتے برسوں گزر گئے ہیں
"	اتنی بھی کسی بات پہ یوں ہٹ نہیں کرتے	اتنا بھی بس انکار مری جاں نہیں ہوتا
داغ	اس نہیں کا کوئی علاج نہیں	روز کہتے ہیں آپ آج نہیں
"	مانگتا ہوں جو دعا وصل کی اُن کے آگے	چپکے چپکے وہ کہے جاتے ہیں ممکن ہی نہیں
"	اس لئے وصل سے انکار ہے ہم جان گئے	یہ نہ سمجھے کوئی کیا جلد کہا مان گئے
جلیل	جی چاہتا ہے پھر کوئی تجھ سے کروں سوال	تیری نہیں نہیں نے غضب کا مزا دیا
رسا	میں سوالِ وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا	ہنس کے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے
آگاہ دہلوی	میں نے سوالِ وصل جو اُن سے کیا کبھی	بولے نصیب میں ہے تو ہو جائیگا کبھی
ریاض گورکھپوری	آگے قابو میں نہ کہئے پیار رہنے دیجئے	پیارے پیارے منہ سے اب انکار رہنے دیجئے
مفتوں دہلوی	دستِ شوق ہائے جھٹک کر یہ کسی کا کہنا	منہ لگا نا ہی غضب ہو گیا - اِترا ہی گیا
روشن بریلوی	آپ کرتے ہیں بار بار نہیں	ہم کو ہاں کا بھی اعتبار نہیں
حسرت موہانی	دشوار ہے رندوں پہ انکارِ کرم یکسر	اے ساقیِ جاں پرور کچھ لطف و عنایت بھی
صبی امروہی	سُن لی پئے وصال بہت کچھ نہیں نہیں	اب تو زبان سے بہرِ خدا "ہاں" نکالئے
قیصر دہلوی	یاد کی شرط لگا دیتے ہو وعدہ کر کے	خوب انکار کا پہلو ہے یہ اقرار کے ساتھ
انشا	گالی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی	یہ سب سہی پہ ایک نہیں کی نہیں سہی
رشک	کبھی جب بات مطلب کی تو وہ کہنے لگے ہنسکر	کہ سب کچھ اور ممکن ہے پر ایسا ہو نہیں سکتا
رعنا	پھر اس نہیں کا لطف دکھا دیں گے آپ کو	سن لی اگر خدا نے ہماری دعا کبھی
نازنہ والی خیرپور سندھ	ہو گئی عادت تمہیں تو وصل میں انکار کی	پھر وہی جھگڑا نکالا - پھر وہی تکرار کی

امتحان

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مُشتِ خاک کے
صبا لکھنوی

گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل
آئی صدا۔ یہی تو مقام امتحاں کے ہیں
امیر مینائی

مہر و وفا میں یار نے جب امتحاں لیا
سب عاشقوں میں نمبرِ اوّل ہمیں رہے
نامعلوم

یہی ہے آزمانا۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
غالب

کہیں ایسا نہ ہو مر جاؤں میں حسرت ہی حسرت میں
جو لینا ہو تو لیلو۔ سب سے پہلے امتحاں میرا
جاوید لکھنوی

امتحاں نالۂ دل کا تو دکھا دوں لیکن
یہ تو سمجھو کہ فلک ٹوٹ پڑیگا کس پہ
داغ

وفا کا امتحاں دو گے ہٹو جاؤ۔ چلو بیٹھو
تمہارے جھوٹے وعدے کی سند کیا ہو نہیں سکتا
بیخود دہلوی

غیر بھرتے بہت ہیں عشق کا دم
ایک دن آزمائیے تو سہی
مشتری

امتحاں چاہنے والوں کا ستمگر کیسا ؟
آن پر تیری مرے جاتے ہیں خنجر کیسا
قیصر دہلوی

اور بڑھ جائیں گی بدنامیاں سوا ہوگے
آزماؤ نہ خدا کے لئے الفت میری
نامعلوم

عاشقِ جانباز کا تو آزمانا چھوڑ دے
آزما۔ پر آزمانے کا بہانہ چھوڑ دے
ضامن

رہیگا کیوں کوئی طرزِ ستم باقی زمانے میں
مزا آتا ہے اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں
نامعلوم

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے
کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے
جلال

باز آؤ اب بھی عاشقوں کے امتحان سے
مشہور ہو جفا میں سوا آسمان سے
نامعلوم

شرمندہ ہوگے رہنے بھی دو امتحان کو
رکھے گا تم سے کون عزیز اپنی جان کو
میر تقی

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو
مومن

تا کجا یہ امتحانِ طاقتِ صبر و شکیب
جانِ جاں آخر دلِ عشاق کی بنیاد کیا
عیشی

ہمارا امتحاں کرتے ہو لیکن
تمہارا بھی اسی میں امتحاں ہے
بینظیر شاہ

بنی ہے جان پہ کیا خاک امتحاں لیں گے
اب آزمائیں گے کیا خاک آزما کے مجھے
مطلب

اخلاق - آدمیت سیرت

(دیکھو تواضع)

چکبست لکھنوی
دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نامعلوم
اخلاق سب سے کرنا تسخیر ہے تو یہ ہے
خاک آپ کو سمجھنا اکسیر ہے تو یہ ہے

ناسخ
آرام کیا کہ جس سے ہو تکلیف اور کو
پھینکو کبھی نہ پاؤں سے کانٹا نکال کے

غالب
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

جو بھلے ہیں وہ بُروں کو بھی بھلا کہتے ہیں
نہ بُرا سُنتے ہیں اچھے نہ بُرا کہتے ہیں

"
یہ کام نہیں آساں انسان کو مشکل ہے
دنیا میں بھلا ہونا دنیا کا بھلا کرنا

"
دنیا میں کہنے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے
پر ہے وہی بھلا۔ جو کسی کا بھلا کرے

"
حُسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بدون
جن گلوں میں بُو نہیں وہ خوشنما کہنے کو ہیں

ذوق
رُکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

اسمٰعیل میرٹھی
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا۔ تمہیں ناگوار ہوتا

ناسخ
میں۔ گو کہ حُسن میں ظاہر ہے مثلِ ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

جوہر
آدمیت ہی تو بنیاد ہے ہر خوبی کی
ہو نہ یہ بھی تو دھرا کیا ہے پھر انسان کے پاس

اکبر الٰہ آبادی
اے حُسن کے مائل یہ نصیحت مری سن لے
سیرت پہ نظر چاہیئے صورت سے زیادہ

یاور
انسانیت بھی شرط ہے انسان کے لئے
صورت بُری بشر کی ہو۔ سیرت بُری نہ ہو

نامعلوم
سیرت نہیں ہے جسمیں وہ صورت فضول ہے
جس گُل میں بُو نہیں ہے وہ کاغذ کا پھول ہے

آصف مالیر کوٹلہ
بُرے ہو اچھی صورت پر بھی گر اچھے نہیں خُو میں
وہی اچھا ہے گُل۔ اچھا جو ہو رنگت میں اور بو میں

عزیز امرتسری
انساں کو چاہیئے نہ کسی پر گراں رہے
مثلِ نسیم۔ رونقِ باغِ جہاں رہے

ذوق
بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

اکبر الٰہ آبادی
طفل میں کیونکر ہو خُو ماں باپ کے اطوار کی
دُودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

بُرائی نہ چاہے۔ بُروں سے نباہے | اگر ہے تو دنیا میں مشکل یہی ہے | داغ

بسکہ دشوار ہے۔ ہر کام کا آساں ہونا | آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا | غالب

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شئے | عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے | ذوق

جب ملے جس سے ملے دل کھول کر لے ملے | اس سے بڑھ کر اور خوبی کوئی انساں میں نہیں | بیخود دہلوی

بشر کو چاہئے پاسِ دلِ بشر رکھے | کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے | راسخ ،،

بشر کو چاہئے ملتا رہے سب سے زمانہ میں | کہ اکدن کام یہ صاحب سلامت آہی جاتی ہے | نامعلوم

ہم ہیں پُر عیب مگر ایک ہنر رکھتے ہیں | جسکے ہو رہتے ہیں اپنا اُسے کر رکھتے ہیں | سخی امروہی

بشر نے خاک پایا لعل پایا۔ یا گُہر پایا | مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اس نے بھر پایا | نامعلوم

وہ خار ہوں کسی سے اُلجھتا نہیں ہوں میں | دشمن کی آنکھ میں بھی کھٹکتا نہیں ہوں میں | حیرت دہلوی

ہوئے جس کے ہوئے بیخود | یار اپنا تو یہی حساب رہا | بیخود ،،

اُن کی یہ خوبئ اخلاق کہ وعدہ تو کیا | میری یہ شومئ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا | رسا مصطفےٰ آبادی

ہم نے تم کو خوب دیکھا ہے مثالِ آئینہ | پیٹھ پیچھے کچھ ہو تم۔ اور روبرو کچھ اور ہو | نامعلوم

آدمی میں گر نہیں علم و ہنر عقل و ادب | ہے وہ چوپایہ سے بدتر یوں بشر ہو نیکو ہے | کیف

معیشت ہم فقیروں کی ہے اخوانِ زماں سے کر | کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا | میر تقی

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے

اہلِ غرور و حرص کو کیا علم سے شرف | تا چرخ بھی پہنچ کے وہ شیطان ہی رہے | اکبر الہ آبادی

صحبتِ عیسیٰ بنائے خر کو انساں کس طرح | تربیت سے واقعی نااہل دانا کب بنے | ذوق

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے | لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا | ،،

یوں تو پڑھ لیتا ہے طوطا بھی "نبی جی بھیجے" | آدمی ہوتا ہے انسان بڑی مشکل سے | نامعلوم

عالم وہ کیا عمل نہ ہو جس کا کتاب پر | بے فائدہ ورق یونہی غافل اُلٹ گیا | ،،

آبرو۔ عزّت

تسلیم لکھنوی
چاہیئے انسان کو ہر وقت حفظِ آبرو
پھر گہر رہتا نہیں۔ آب گہر جانے کے بعد

نامعلوم
لیسے جینے سے تو ہے ڈوب کے مرنا بہتر
آبرو جس کی نہ ہو وہ کوئی انساں ہی نہیں

یوسف
آبرو وہ ہے جو ہو حشر کے دن او منعم
ہم کو دنیا میں نہیں عزّت و توقیر پسند

داغ
نہ کسی شخص کی عزّت نہ کسی کی توقیر
عاشق آتے ہیں تمہارے کہ غلام آتے ہیں

ظہیر
بزمِ دشمن میں اُٹھا وہ نیم قد تعظیم کو
اب ہماری عزّت و توقیر آدھی رہ گئی

نامعلوم
محفل میں تیری آکے یہ بے آبرو ہوئے
پہلے تھے آپ۔ آپ سے تم۔ تم سے تو ہوئے

〃
بتوں کی جھڑکیاں کھاتا ہوں اکثر
یہ میری آبرو ہے اور میں ہوں

بیخود دہلوی
دل کا سودا نہیں کرنا مجھے تحقیر کے ساتھ
جان حاضر ہے۔ اگر لیجئے توقیر کے ساتھ

غالب
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

〃
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

داغ
خاک میں داغ ملاتے ہیں جو عزّت تیری
مر بھی کمبخت کہ ایسوں ہی سے تو ملتا ہے

تحسین دہلوی
ہوئے ذلیل تو عزّت کی جستجو کیا ہے
کیا جو عشق تو پھر پاسِ آبرو کیا ہے

میر تقی میر
پھرتے ہیں میر خوار۔ کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

مضطر
عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
آپ جو ناکام ہو۔ اُس کو کسی سے کام کیا

قائم چاندپوری
گہہ پیرِ شیخ و گاہ مریدِ مغاں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہی جہاں رہے

آبرو جاکے نہیں آتی

نامعلوم — رباعی
پاسکتا ہے پھر جو زر لٹائے کوئی
کیا پائے جو آبرو گنوائے کوئی
بکھرے ہوئے موتی تو سمٹ سکتے ہیں
ٹپکے ہوئے اشک کیا اٹھائے کوئی

اشراف گردی

ترک کرو صاحب نسب نامہ وہ وقت آیا ہے اب	بے اثر ہوگی شرافت مال دیکھا جائے گا	اکبر الٰہ آبادی
ان روزوں خانداں کو کوئی پوچھتا نہیں	عزّت ہے آدمی کی بس اب سیم و زر کے ساتھ	نامعلوم
غضب اشراف گردی ہے الٰہی اس زمانہ میں	اُنھی پر ہیں زیادہ مشکلیں جو خاندانی ہیں	رونق دہلوی
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارب	جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیکار بیٹھے ہیں	انشا
ہے بروں کو عیش اور اچھوں کو ہے دنیا میں رنج	توڑتا ہے گُل کو گلچیں چھوڑتا ہے خار کو	ناسخ
عبرت کی ہے جگہ جنہیں کل تک عروج تھا	محتاج آج حیف وہ گور و کفن کے ہیں	ریاض گورکھپوری
کمبل بھی اوڑھنے کو نہیں اب اُنہیں نصیب	دیتے تھے جو فقیر کو رومال شال کا	دلیر
بڑھاتا ہے فلک ادنیٰ کو اعلےٰ کو گھٹاتا ہے	ترقی ہے مہِ نو کو۔ تنزل ماہِ کامل کو	عطش
دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں	تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا	میر تقی میر
محتاجی سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا	عزّت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا	نامعلوم
روا رکھ کلفتِ ایام میں بھی قدر نیکوں کی	پھٹے کپڑوں میں بھی اُنکو سمجھ لے لال گودڑ کا	آتش
مصیبت میں شریفوں کی کبھی عزّت نہیں گھٹتی	جلا بھی ڈالو سونے کو مگر قیمت نہیں گھٹتی	نامعلوم
جو عالی ہیں ضرر پاتے نہیں اسفل سے وہ ہرگز	فرشتوں کو نہیں ہے گردشِ افلاک کا شکوہ	"
پختہ مغزانِ جنوں سے ہر کسی کو جنگ ہے	جو ثمر پکّا سو پامالِ جفائے سنگ ہے	ہدایت شاہجہاں پوری

اِنصاف

عالم ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے	اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے	میر انیس
انصاف ہو کسطرح کہ دل صاف نہیں ہے	دل صاف ہو کسطرح کہ انصاف نہیں ہے	مرزا دبیر
حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو	کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائیگا	آغا شاعر

اشک - آنسو

ذاکر دہلوی	اثر ہیں دو طرح کے ایک میرے اشکِ فرقت میں	جو بہ جائے تو دریا ہو جو رک جائے تو گوہر ہو
طالب رامپوری	اشک اُمڈا ہے مرا- ابر سے کہدو جاکر	آبرو چاہے تو ہٹ کر مرے گھر سے برسے
مضمون بانج منو	یہ اشک آنکھوں میں قاصد کس لئے اکدم نہیں تھمتا	دلِ بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے
	اشکوں کا وجود جذب کامل سے ہے	اور ان سے تمیزِ حق کی باطل سے ہے
نادر کاکوروی	رباعی	
	ان میں وہ صدق ہے کہ جس کا اظہار	آنکھوں سے ہے زبان سے ہے دل سے ہے
نازو لائی خیرپور سندھ	بڑی ہیٹی ہوئی ٹپکے جو بزمِ غیر میں آنسو	پرکھ اِن موتیوں کی دیدۂ غماز کیا جانے
قوی امروہی	آئے چشمِ تر نہ اشک بہا اُن کے سامنے	موتی ملا کے خاک میں بے آبرو نہ ہو
سودا	اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک	لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے
	چونکہ ہمدردی سے پیدا عشق کا ہوتا ہے درد	اور صداقت کیلئے ہوتی ہے کافی اک نظر
نادر کاکوروی	قطعہ	
	ہونٹھ دیدیتے ہیں مصنوعی تبسم سے فریب	امتحانِ عشقِ صادق ایک آنسو ہے مگر
نامعلوم	دیدۂ گریاں میں غلطاں ہے ترا عکسِ جمال	میرا آنسو ہے کہ شیشہ ہے تمہی تصویر کا
〃	طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ	دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں
〃	ہے گہر جو اشک میرے دیدۂ پُرنم میں ہے	اے خوشی کیا جانے تو کیا لطف میرے غم میں ہے
ذکا دہلوی	فوجِ اشک و لشکرِ داغ اور علم ہے آہ کا	دھوم سے آتا ہوا ہے عشقِ عالیجاہ کا
جلیل مانکپوری	آنکھوں میں کون آکے الٰہی نکل گیا	کسکی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے
نامعلوم	وہ اشک کیا ہی جسمیں کہ لختِ جگر نہیں	کیا آستیں ہے وہ کہ لہو میں جو تر نہیں
میر درد	اے آنسوؤں نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر	لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا
واقف خلف شاہ ظفر	سو لختِ جگر ساتھ ہیں سو پارۂ دل ہیں	اشک آنکھ سے اس شان سے اس دھوم سے نکلا
منیر شکوہ آبادی	کبھی تھے یہ کوچۂ یار میں کبھی دل کے جیب و کنار میں	مرے اشک فصلِ بہار ہیں نہیں دامنِ گلِ تر سے خوش

آنکھ

وہ چشم مست پھر اُس پر وہ پنجۂ مژگاں ہو جیسے ہاتھ کسی نازنیں کا ساغر پر — داغ
نہ چھوڑے گی جیتا مجھے چشم قاتل یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے — ذوق
مرے ہوئے تری آنکھوں پہ یار ہم بھی ہیں شہیدِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں — نامعلوم
کر دیا عشق نے پہلے ہی ہمیں تو اندھا تو دکھاتا ہے کسے او ستم ایجاد آنکھیں — نازوائی خیرپور سندھ
آنکھیں دکھائیو نہ تم اے دلربا مجھے اِن کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے — نامعلوم
آنکھ کیا ہے موہنی ہے سحر ہے اعجاز ہے اک نگاہِ لطف میں سارا گلہ جاتا رہا — امیر مینائی
کیا کرونگا لیکے واعظ ہاتھ سے حوروں کے جام ہوں میں ساغر کش کسی کے ساغرِ مخمور کا — سودا
مست ہاتھی ہے تری چشم سیہ مست اے یار صفِ مژگاں اُسے گھیرے ہوئے ہیں بھالوں سے — آتش
فتنہ بنجاتی ہے شوخی آکے چشم یار میں زور دیکھا حشر ڈھانے کا اسی بیمار میں — قیصر دہلوی
آنکھیں وہ آنکھیں ہیں دیکھا ہو جن آنکھوں نے تجھے دل وہی دل ہے کہ جس دل میں تری یاد رہے — بیدم اکبرآبادی
نہیں آنکھوں میں آپکے ڈورے یہ محبت کا جال ہے شاید — انور بمبئی

اطمینانِ دل سرورِ قلب

حاصل ہو کچھ معاش یہ محنت کی بات ہے لیکن سرورِ قلب۔ یہ قسمت کی بات ہے — اکبر الہ آبادی
فتنہ نہیں فساد نہیں شور و شر نہیں یاں زن نہیں۔ زمین نہیں اور زر نہیں — ”
نہ عاشق کو شکوہ نہ معشوق سرکش الٰہی وہ کیا عہد کیا دور ہو گا — داغ
وہی جنت ہے جہاں چین سے دل بہلے جس پہ دل آئے وہی حور ہے انساں کیلئے — نامعلوم
ہے وصل میں راحت نہ جدائی میں الم ہے آئے کی نہ شادی۔ نہ گئے کا مجھے غم ہے — امیر
حسرتِ ہجر نہ ارمانِ وصال اچھا ہے جس سے بہلائے ہے دل کچھ وہ خیال اچھا ہے — عارف لکھنوی

انگڑائی

تونگر	ہالے کی شکل گردِ رُخِ ماہوش ہوئی	انگڑائی لی جو یار نے دونو بلا کے ہاتھ
ناسخ	دریائے حُسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا	انگڑائی اُس نے نشہ میں لی جب اُٹھا کے ہاتھ
نظام رامپوری	انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ	دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ
سائل دہلوی	دیر تک اِس شُبہ میں دیکھا ہلال	یہ کسی کافر کی انگڑائی نہ ہو
مشتاق دہلوی	جہاں جاگے وہیں انگڑائیاں لو	یہاں پھیلائی ہے سُستی کہاں کی
امیر مینائی	عہدشکن ہم سے آج وہ رشکِ قمر کھلا	انگڑائی لی تو سمجھے کہ مقصد کا در کھُلا
عزیز لکھنوی	اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن	بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
مصحفی امروہی	انگڑائی لے کے اپنا مجھ پر خمار ڈالا	کافر کی اِس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا
راسخ دہلوی	دبے فتنے قیامت بنکے اُٹھتے ہیں قیامت ہے،	وہ جب انگڑائیاں لے لیکے سینہ تان لیتے ہیں
نامعلوم	الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی	مرے سینہ میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں
جرأت	عبث انگڑائیاں لے لیکے کیوں ملتے ہو آنکھوں کو	بھلا یہ بھی تو گھر ہے سو رہو گر نیند آئی ہے

اِختلاط (دیکھو راز و نیاز)

نظام رامپوری	تم سے کچھ کہنے کو تھا۔ بھول گیا	ہائے کیا بات تھی۔ کیا بھول گیا
اکبر الٰہ آبادی	جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر	ہنس کے کہنے لگے۔ اور آپکو آتا کیا ہے
"	کہا جو مینے کہ دل چاہتا ہے پیار کروں	تو مُسکرا کے وہ کہنے لگے کہ پیار کے بعد؟
نامعلوم	خیال اور کچھ لے رشکِ حور ہوتا ہے	خطا معاف ہو مجھ سے قصور ہوتا ہے
بیخود دہلوی	کس کی قسمت میں ہو تم۔ یہ تو بتادو مجھ کو	کس کے کام آئیگی دنیا میں یہ پیاری صورت
اقبال	سو سو اُمید بندھتی ہے اِک اِک نگاہ پہ	مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

بوسہ

بوسہ دینے میں جو پوچھا کہ بگڑتا کیا ہے	بولے لینے میں کہو آپ کو ملتا کیا ہے	نامعلوم
کون کہتا ہے کہ بوسہ دو ہمیں	منہ فقط رکھ لینے دو رخسار پر	"
ایک بوسہ کے طلبگار ہیں ہم	اور مانگیں تو گنہگار ہیں ہم	زار
بوسے اپنے عارضِ گلفام کے	لا مجھے دیدے۔ ترے کس کام کے	نامعلوم
بوسہ رخسار پر تکرار رہنے دیجئے	لیجئے یا دیجئے۔ انکار رہنے دیجئے	حفیظ جونپوری
اک بوسہ طلب کرتے ہیں آج حُسن کی خیرات	وہ ایسے امورات میں سوچا نہیں کرتے	نامعلوم
بحث پڑی ہے بوسوں میں	لینا ایک نہ دینا دو	منیر شکوہ آبادی
اگر اک لے لیا بوسہ خطا اس کو نہیں کہتے	محبت کہتے ہیں ترکِ حیا اس کو نہیں کہتے	تصویر دہلوی
لے لیا جو بوسہ میں نے بندہ پرور کیا ہوا	پیار میں لب رکھدئے پیارے لبوں پر کیا ہوا	رخشاں
ایک بوسہ کے لئے مُنہ کو چھپایا یار نے	جان مجھ سے مانگتا اور میری ہمت دیکھتا	نامعلوم
پھیر دو بوسے رُخِ گلفام کے	غیر کے جھوٹے مرے کس کام کے	راسخ
لے لو بوسہ اپنا واپس کس لئے تکرار کی	کیا کوئی جاگیر ہمنے چھین لی سرکار کی	اکبر میرٹھی
ہم تو کیوں کر کہیں کہ بوسہ دو	گر عنایت کرو۔ عنایت ہے	حکیم دہلوی
تخلیہ میں آج میں نے ان کا بوسہ لے لیا	دیکھئے ڈگری جو ہو دعوئے تو دائر ہو گیا	اکبر الہ آبادی
قندِ لب کا اُن کے بوسہ بے تکلّف لے لیا	گالیاں کھائیں بلا سے مُنہ تو میٹھا ہو گیا	مفتوں دہلوی
آج بوسے اُن کے گن گن کے لئے	دن گنا کرتے تھے اس دن کے لئے	قوی امروہی
وصل کی شب آپ بوسوں پر خفا ہونے لگے	کیا مزے کی بات تھی کیوں بدمزہ ہونے لگے	نامعلوم
بوسہ جو رُخ کا دیتے نہیں لب کا دیجئے	ہے یہ مثل کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی	ذوق
بوسہ مجکو نہیں دیتے ہو تو جھڑکی ہی سہی	نہیں دروازہ جو کھل سکتا تو کھڑکی ہی سہی	انشاء

بناؤ سنگار

نشتر
تقدیر کس کی جاگی۔ کس سے ہوا ہے وعدہ
کس کے لئے بناؤ سنگار ہو رہا ہے

نامعلوم
کہو تو کیوں ہے یہ بننا سنورنا
میری جاں۔ جان لو گے کیا کسی کی

شفق رضوی
نکھرنے ہی سنورنے سے وہاں فرصت نہیں اُنکو
یہاں غسل و کفن سہی۔ مرنے والے نے فراغت کی

شاہ ظفر — رباعی
مرے جی میں ہے پوچھوں انجان بن کے
چلے کس کے گھر آج مہمان بن کے
مسی مل کے۔ کاجل لگا کر چلے ہو
کہاں تم دھواں دار ایجان بن کے

اکبر الہ آبادی
بڑھتا جاتا ہے اُدھر شوق خود آرائی کا
حوصلہ پست ہے یہاں ضبط و شکیبائی کا

ذوق
چُنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے

مائل دہلوی
آئینہ سامنے ہے خود لطف اُٹھا رہے ہیں
زلفیں بنا بنا کر۔ زیور بدل بدل کر

رضا دہلوی
سبزے ہیں اُس کے کانوں میں اس آب و تاب کے
جیسے کہ برگ سبز ہوں نیچے گلاب کے

رند لکھنوی
چھپی او مہروش۔ تجھ کو نہ دھانی چاہیئے
چاند مکھڑا ہے۔ دوپٹہ آسمانی چاہیئے

قادر دہلوی
مانگ بالوں میں نہیں اُس کے عیاں بالائے سر
نہر حیواں کی ہے ظلمت میں رواں بالائے سر

اکبر الہ آبادی
یہ عمر یہ حسن اور ناز و ادا۔ اس پر یہ سنگار اللہ اللہ
مستیٔ نگہ۔ اُف اُف کی جگہ۔ سینہ کا اُبھار اللہ اللہ

بیوی۔ عورت

تقوی امروہی — قطعہ
ہو اگر بیوی حسین و نیک سیرت باوفا
نعمتِ پاکیزۂ خلّاقِ عالم ہے وہی
اور اگر بدقسمتی سے ہو گیا اس کے خلاف
مرد کے حق میں عذابِ صد جہنّم ہے وہی

جوش ملیح آبادی
اِس کے جیسا کوئی نیک اور اس کے جیسا بد نہیں
اسکی نفرت اور محبّت دونوں کی کچھ حد نہیں
گر نہ مانے تو بلا ہے آدمی کی جان کو
ماننے پر آئے تو سجدہ کرے شیطان کو

بُلاوا

تصوّر سے کہانتک میں دلِ مضطر کو بہلاؤں / کسی صورت سے اب صورت دکھا جاؤ تو اچھا ہو — ہاشم

تسلّی ہووے کوئی دم تو جانِ مضطر کو / خدا کیواسطے مرتا ہوں آ گھڑی بھر کو — رند

اس طرف بھی آنکل اے چاند کے ٹکڑے کبھی / میرے ویرانہ میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی — نامعلوم

ہمارے خانۂ ویراں میں جب چاہو چلے آؤ / فقیروں کا سا تکیہ ہے نہ در ہے اور نہ درباں ہے — ”

جان آنکھوں میں۔ نظر در پہ۔ تمنا دل میں / اب تو دم بھر کو خدا کے لئے آئے کوئی — ”

خود آؤ یا بلاؤ ہمیں اپنی بزم میں / مطلب تو دو گھڑی کی ہمیں دل لگی سے ہے — ”

آج تو آپ سرِ شام چلے آئیں ضرور / لاکھوں وعدے ہیں مگر ایک تو سچا نکلے — تجلّی دہلوی

کیوں وعدہ کرو بے خبر آجاؤ کسی وقت / ہوں وصل کا خواہاں نہیں مشتاق خبر کا — ثاقب ”

ہر روز تو میں یہ نہیں کہتا کہ آئیے / فرصت نہیں ہے آنے کی بھی گاہ گاہ کیا — تسلیم (رام

جو بندہ خانہ میں آئیگا۔ فقیر تم کو دعا کرے گا / کسی کے دلکو جو خوش کروگے خدا تمہارا بھلا کریگا — حسن دہلوی

ہے مریضِ عشق کا آنکھوں میں دم / آن چھوڑو۔ دیکھ جاؤ۔ آن کر — جالب ”

منظور وہ کرنے لگے کیوں دعوتِ اکبر / خیر اس سے ہو کیا بحث ہم اصرار تو کرلیں — اکبر الہ آباد

ملتے ہو رقیبوں سے مرے گھر نہیں آتے / اللہ تمہیں اتنی بھی فرصت نہیں ملتی — صولت بنا

گھر دو ہی قدم پر تو ہے ان قدموں کے صدقے / بڑھئے کوئی دو چار قدم اور زیادہ — حشمت

میرے گھر ہے قصد آنے کا تو آؤ ناز سے / پر ذرا چھپ کر سپہرِ تفرقہ پرداز سے — امیر مینائ

چھوڑوں گا میں نہ ہاتھ چلے آؤ ساتھ ساتھ / نازک کلائی دُکھتی ہے تو آستیں سہی — داغ

کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن / نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہوگا بستر کو — لطف استر

میں آنکھیں بچھاؤں مرے گھر آپ اگر آئیں / درویش ہوں۔ آزاد ہوں۔ بستر تو نہیں ہے — وزیر

ہوئے صحرا نشیں تشریف لائے جسکا جی چاہے / در و دَرباں نہیں یہ گھر ہے آئے جسکا جی چاہے — جوش عظیم آب

بہانہ۔ عذر۔ حیلہ حوالہ

نامعلوم	شب وصل پھر اُن کو سوجھا بہانہ	دوپٹے کے آنچل سے سر باندھتے ہیں
مجنوں اٹارسی	صاف انکار ہے۔ آنے کا۔ بہانہ کیسا	رنگ لائے ہیں وہ مہندی کا لگانا کیسا
رگھو شنکر ناتھ صبا دہلوی	ہوں میں صدقے ترے بہانے کے	روز ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے
ناظم والی رامپور	بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں	اظہار پاکبازی و ذوق نظر غلط
امیر مینائی	ٹالتے ہیں روز وہ۔ پر دل مرا مسرور ہے	آجکل کبتک کریں گے کیا قیامت دور ہے
حیرت دہلوی	اپنا یہ حال۔ جان چلی اضطراب میں	اُن کا یہ قول۔ ٹالئے برسوں جواب میں
ماہ	ہر روز نیا وعدہ ہے۔ ہر روز نیا عذر	بن بن کے بگڑتا ہے۔ مقدر کئی دن سے
نامعلوم	آزمانے کے قرینے اور ہیں	آزمانے کا بہانہ چھوڑ دے
مومن	کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا	تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
نامعلوم	جو ملنے پہ آؤ بہانے بہت ہیں	جگہ سینکڑوں ہیں ٹھکانے بہت ہیں
خلش	وعدہ کرجاؤ مرے دل کے بہلنے کے لئے	سینکڑوں حیلہ ہیں پھر وقت پہ ٹلنے کے لئے
حالی	کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی	آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں
قیصر دہلوی	کبھی بیمار بنتا ہوں۔ کبھی بے موت مرتا ہوں	بلاتا ہوں کسی کافر کو میں کس کس بہانہ سے
رنگ	دردِ سر کا کبھی حیلہ ہے کبھی عذرِ حنا	مہرباں آپ کے یہ حیلے حوالے نہ گئے
ذاکر دہلوی	آنے میں شرط کیسی۔ ہر بات صاف اچھی	کچھ فائدہ نہیں ہے لے جان اگر مگر میں
امین عظیم آبادی	گر ارادہ نہیں ہے آنے کا	فائدہ اس قدر بہانے کا
نامعلوم	یہ عبث کہتے ہو موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی	مہندی پاؤں میں نہ تھی آپکے برسات نہ تھی
"	کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی (مخمسہ)	دل کو آسکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی
"	بس یہ کہئے ہمیں منظور ملاقات نہ تھی	

بدگمانی - وہم

تمہیں میری محبت کی قسم سچ سچ بتا دینا	گلے میں ڈالکر باہیں۔ منانا کس سے سیکھا ہے	نامعلوم
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو	دینے لگا ہے بوسہ۔ بغیر التجا کئے	غالب
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام	ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں	،،
بناوٹ سمجھتے ہو رونے کو میرے	مجھے تو ہے۔ اے جان رونا اسی کا	امیر مینائی
دمبدم کہہ بیٹھنا بس جاؤ اپنے اُن کے پاس	کیوں نہیں جاتی ہے ابتک بدگمانی آپ کی	انشا مرحوم
مجھے ڈالا ہے سَو وہم و گماں ہیں	بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو	حالی
میری خوشی کا اُن کو نہایت خیال ہے	کچھ ان دنوں میں غیر سے شاید ملال ہے	شیفتہ دہلوی
غیر کے کہنے پہ ناداں مجھ سے بدظن ہو گیا	جھوٹ کو بھی کیا اثر ہے دوست دشمن ہو گیا	شہیدی
میں نے کہا جو اُن سے کہ شب کو یہیں رہو	آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر	صفدر رامپوری
اب وہم کا علاج کہ خط دیکھے ان کے نام	آگے چلے ہیں چار قدم نامہ بر سے ہم	رسا ،،
آیا ہے اُن کو دیکھ کے میرے علاج کو	اب اور کچھ گمان مجھے چارہ گر سے ہے	مضطر خیرآبادی
نام دل کا قلب ہے اور کہتے ہیں پھرنے کو قلب	دل کا کیا پھرنا۔ جب آئی بدگمانی۔ پھر گیا	شاہ ظفر
ہم پہ بہتان اور کی الفت کے ہیں	لے ترے سر کی قسم کھاتے ہیں ہم	نامعلوم
بگڑتے کیوں ہو بیجا تمنے آپ میری بدگمانی پر	محبت دلمیں ہوتی ہے تو کھٹکا ہو ہی جاتا ہے	مائل دہلوی
تم پارسا سہی۔ مگر اتنا تو سوچ لو	کچھ دیکھ ہی لیا ہے۔ جو دل بدگماں ہے اب	داغ
بظاہر مہربانی ہے۔ تو دل میں بدگمانی ہے	سلام ایسی عنایت کو۔ عنایت اپنی رہنے دو	،،
کریگا بیوفائی مجھسے تو۔ سامان ایسے ہیں	تری جانب سے مجکو وہم۔ میری جان ایسے ہیں	،،
لنڈن میں بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے	تم پاس رہو میرے۔ بڑا پاس یہی ہے	اکبر الہ آبادی
آج سنتے ہیں۔ وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں	کون جانے دلمیں کیا ہے۔ منہ سے کیا کہنے کو ہیں	جلیل

بہار۔ برسات (دیکھو شراب و ساقی حصہ دویم)

نامعلوم	لطفِ چمن ہے۔ بادۂ گلگوں ہے۔ یار ہے	اب موسم بہار میں۔ مانگوں خدا سے کیا
ریاض خیرآبادی	وہ بھی کیا وقت ہے۔ جب دل ہیں شگفتہ ہوتے	وہ بھی کیا وقت ہے جب پھول کھلا کرتے ہیں
امیر مینائی	کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے	ہائے اس وقت مرا گیسوؤں والا ہوتا
غالب	آمد بہار کی ہے۔ جو بلبل ہے نغمہ سنج	اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
ناسخ	خلوت ہے کنج باغ ہے۔ فصلِ بہار ہے	ساقی شتاب آ۔ کہ ترا انتظار ہے
جلیل	ہاتھ اُٹھیں یا نہ اُٹھیں۔ آگئی جب دن بہار	مثلِ گل خود پرزے پرزے پیرہن ہو جائیگا
خنداں	فصلِ بہار میں ہے یہ داغ جنوں کا حال	جیسے کوئی چراغ کی بتی اُبھار دے
قوی امروہی	دن پھر نصیب ہو گئے فصلِ بہار کے	لا ساقیا پلا کوئی شیشہ اُتار کے
آتش	فصلِ بہار آئی۔ پیو۔ صوفیو شراب	بس ہو چکی نماز مصلےٰ اُٹھائیے
تسلیم	چاندسی صورت کا دلبر جن کے پہلو میں رہے	پوچھیے اُن خوش نصیبوں سے مزا برسات کا
تسلیم لکھنوی	ناصح خطا معاف۔ سُنیں کیا بہار میں	ہم اختیار میں ہیں۔ نہ دل اختیار میں
نامعلوم	آیا جو موسم گل۔ تو یہ حساب ہوگا	ہم ہوں گے۔ یار ہوگا۔ جامِ شراب ہوگا
مست بنارسی	بہار آئے تو پھر بادہ خوار ہم بھی ہیں	جو فصلِ گل ہو تو یاروں کے یار ہم بھی ہیں
جلیل	پھر سر چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں	پھر ہوا کھانے حسیں گیسوؤں والے نکلے
دہیر	گھٹا چھائی ہے۔ بجلی کوندتی ہے۔ رات کالی ہے	یہ عالم۔ یہ شباب۔ اب توبہ کا اللہ والی ہے
منتظر	جامِ شراب چھینکر پی لیا شیخ جی نے آج	دل ہی تو ہے مچلگیا۔ جوشِ بہار دیکھ کر
نامعلوم	یہ کیا غضب ہے یہ کیا ستم ہے کہ ہائے ابتک نہ یار آیا	اِدھر وہ ساقی شراب لایا۔ اُدھر وہ ابر بہار آیا
رند	میکشوں سے ترکِ مے ممکن نہیں برسات میں	پانی بھر آتا ہے مُنہ میں ابر باراں دیکھ کر
قیصر دہلوی	گھٹا کے ساتھ آئے ہیں مے گلگوں کے متوالے	پلا پیر مغاں موسم ہے یہ پینے پلانے کا

آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا — سُرخ مے۔ کالی گھٹا۔ اور سبزہ ہے مینا کا رنگ — بیدار دہلوی

ساقی سے روز پوچھتے ہیں یہ حساب ہم — اب کتنے دن ہیں آمدِ فصلِ بہار کے — نامعلوم

ہمنے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار — مظہر

ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک — جی نکلجاتا ہے جب سُنتے ہیں آتی ہے بہار — جانجاناں

بے ثباتیِ دُنیا

پھول اے بُلبل نہ پھولوں پر دو روزہ ہی بہار — ایک جھونکے میں ہوا سب رنگ و بو ہو جائیگا — امیر مینائی

گُل اپنے رنگ و روپ پہ پھولا ہوا ہے کیا — دو دن کی ہے بہار۔ ہمیشہ دھرا ہے کیا — خنجر

حُسن اکدن اے حسینو بے نشاں ہو جائیگا — غیرتِ شمشاد قد۔ رشکِ کماں ہو جائیگا — نامعلوم

یہ آب و تاب ہو دو چار دن۔ دولت پناہی سے — ٹپک جائینگے آنسو بن کے موتی تاجِ شاہی سے — امیر مینائی

کس باغ میں آسیبِ خزاں آ نہیں جاتا — گل کونسا کھلتا ہی جو مرجھا نہیں جاتا — نامعلوم

کیا دل لگائیں گلشنِ عالم ہے بے ثبات — آئے ہیں چار دن کے لئے اس چمن میں ہم — مست بنارسی

رباعی — نامعلوم

یہ عیش و نشاط و شادمانی کب تک — عشرت بھی ہوئی تو پھر جوانی کب تک
گر یہ بھی سہی۔ قیامِ دولت ہے محال — دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک

رباعی — حاصی دہلوی

چمن کے تخت پر جسدم۔ شہِ گل کا تجمّل تھا — ہزاروں بلبلوں کا شور تھا فریاد تھی غُل تھا
خزاں کے دن گئے تو کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں — بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

نہ ہم ہوں گے۔ نہ تم ہوگے کسی دن — زمیں کہتی ہے رو کر آسماں سے — اکبر میرٹھی

بہارِ زندگی اک خوابِ غفلت کا زمانہ ہے — خیالی چہچہے ہیں۔ اور ہوائے آشیانہ ہے — فصیح

صدائے کوسِ رحلت نغمہ سنجوں کا ترانہ ہے — جسے کہتے ہیں دنیا وہ کہانی ہے فسانہ ہے — محمد دلاور شاہ

جولائیں کام میں چشمِ بصیرت دیکھنے والے
بنیں محوِ تماشہ۔ اُسکی قدرت دیکھنے والے

نامعلوم — چار دن بھی نہ ٹھیرا اس سرائے دہر میں / اک تماشہ بن گیا۔ آنا مرا۔ جانا مرا

" — آئے ہوئی اذاں۔ چلے جب۔ ہوئی نماز / یہ عرصۂ حیات ہے کیا آئے کیا چلے

ذہین — زندگانی کا زمانہ میں بھروسہ کیا ہے / جز فنا ہونے کے انسان میں رکھا کیا ہے

سائل امروہی — حقیقت پر نظر کرتا ہوں جب دنیائے فانی کی / بہاریں خاک میں ملجاتی ہیں سب زندگانی کی

جرأت — فردا یہاں سے کوچ ہے بس ہے شب کی شب / جوں شبنم اس چمن میں کیا ہے قیام آج

آتش — دل بھر کے سیر کی نہ خرابات دہر کی / سیلاب کی طرح سے ہم آج آئے کل چلے

" — مگر جانا نہیں شاید کہ یاں سے اہل عالم کو / یہ دو دن کیلئے کیا قصر و ایواں مول لیتے ہیں

غالب — بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے / ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

فروغ کالپی — قید ہستی میں پھنسے یاد وطن بھول گئے / دام ہم کو یہ خوش آیا۔ کہ چمن بھول گئے

ریاض — غافل اگر ہوئی بھی تو حاصل نہیں ہے کچھ / بے اعتبار چیز ہے دنیا کہیں جسے

نامعلوم — زندگی موت تھی اک عمر میں ثابت یہ ہوا / میرا ہونا تھا فقط میرے نہ ہونے کے لیئے

نازوالی خیرپور سندھ — نظر جو بحر فنا میں ہم نے۔ کچھ اپنی ہستی پہ کی تو آخر
قیام موجوں کی طرح پایا۔ ثبات مثل حباب دیکھا

بُخل

آتش — ملنے کو خاک ہی میں بخیلوں کا مال ہے / دیکھو تو ہے کسی کو بھی غنچہ کے زر سے فیض

" — آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے / محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

حافظ پیلی بھیت — رباعی
گوہر کو گرے جمع۔ یہ جوہر ہے تو کیا / جب نفس غنی نہیں۔ تونگر ہے تو کیا
جب جُود نہیں۔ کرم نہیں۔ فیض نہیں / مُٹھی میں جو غنچہ کی طرح زر ہے تو کیا

ثابت لکھنوی — رباعی
پھل پائیں گے جو تخم کرم بو دیں گے / مرقد میں یہ پھول بن کے خوشبو دیں گے
جن کے لیئے چھوڑتا ہے مال او منعم / مرنے پہ وہ مٹی بھی نہ تجھ کو دیں گے

بھولا پن

بھولے پن سے پوچھتے ہیں تیری خاطر کیا کریں	اس محل پر رازِ دل ہم اُن پہ ظاہر کیا کریں	اکبر الٰہ آبادی
اُن کے بھولے پن کے صدقے جائیے	کہتے ہیں مجھ سے تمہیں کیا کام ہے	رنجور عظیم آبادی
بھولے بھالے ہیں حسین ناز و ادا کیا جانیں	چاہنے والے ہی کمبخت سکھا دیتے ہیں	نامعلوم
کبھی سمجھے نہ کوئی ناسمجھ ان بھولے بھالوں کو	سمجھتے ہیں یہی کچھ چاہنے والوں کی چالوں کو	"
الزام بھولے پن کے اُس بدگمان پر ہیں	لاکھوں کے راز پنہاں جسکی زبان پر ہیں	بیخود دہلوی
ایسا ہی تو نادان ہے جو بات نہ سمجھے	بن جاتا ہے وہ جان کے بھولا مرے آگے	"
بھولے پن سے دمِ رخصت یہ سوال اچھا ہے	ہاتھ سینہ پہ ہے کیوں دل کا تو حال اچھا ہے	امیر مینائی
وہ نادان۔ انجان بھولے ہیں ایسے	کہ سب شیوۂ دشمنی جانتے ہیں	داغ
وہ بھولا پن کسی کا۔ آہ بھولا ہے نہ بھولے گا	وہ رو دینا ہنسی میں اور ہنس دینا وہ رونے میں	آزاد عظیم آبادی
بہکا کے تم کو۔ کوئی لگا لے نہ راہ پر	نکلے ہو آج گھر سے مری جان تنے تنے	رند
بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے	کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا	آغا شاعر دہلوی
بڑے بھولے بھالے بڑے صاف دل ہیں	ہمارا ہمیں سے گلا کرنے والے	مست بنارسی
جبیں پر سادگی۔ نیچی نگاہیں بات میں نرمی	مخاطب کون کر سکتا ہے تمکو لفظ قاتل سے	نامعلوم

بھولا بن کے رہنا عقلمندی ہے

بھولا ہی بن کے کام نکلتا ہے گاہ گاہ	بنجاتے ہیں ہم آپ ہی ناداں کبھی کبھی	داغ
ظفر ہے وہی اپنے نزدیک دانا	رہے ہے جو دنیا میں نادان بن کے	شاہ ظفر
دیوانہ بن کے مطلبِ اصلی کیا حصول	مجنوں بھی عاشقوں میں بہت ذی شعور تھا	میر مہدی مجروح
ہوشیاری ہے عین بے ہوشی	خود شناسی ہے خود فراموشی	فخری پانی پتی

بیقراری ۔ بیچینی ۔ بیتابی (دیکھو پریشانی)

داغ	وقت دو مجھ پر کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں	اک ترے آنیسے پہلے۔ اک ترے جانے کے بعد
شاکر میرٹھی	کلیجہ کو رہ رہ کے ملتا ہے کوئی	گزر دل میں کیا پھر ہوا ہے کسی کا
مومن دہلوی	سیماب ہے پہلو میں مرے۔ دل تو نہیں یہ	اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
امیر مینائی	حل نہیں ہوتا معمّا۔ بے قراری کا مری	دل تو پہلو میں نہیں یارب تڑپتا کون ہے
ثابت لکھنوی	یارب یہ کون چٹکیاں لیتا ہے بار بار	پہلو میں یار ہے کہ دلِ بیقرار ہے
قیصر دہلوی	دردِ فرقت سے وہ بیچینی ہے قیصر دم بدم	مجھ سے ہارا ہے۔ مرا ہمزاد اُٹھتے بیٹھتے
وحید	تسکین دردِ دل کو نہ آج ہو نہ کل ہو	بے یار بیکلی ہے۔ وہ ہی ملے تو کل ہو
مومن	قلق نے شب یہ گھبرایا نہ جب وہ ماہرو آیا	کہ جب اُچھلا زمیں سے دامنِ گردوں کو چھو آیا
تسلیم دہلوی	برق نے اک طرزِ بیتابی مرا سیکھا تو کیا	سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطرِ ناشاد میں
ذوق	بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے	اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
غالب	عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب	دلکا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
،،	ہمنے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن	خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
ذوق	پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو	دلِ خانہ خراب کی باتیں
ارمان دہلوی	کلیجہ تھام لوگے حال ہوگا مُرغِ بسمل کا	ذرا سا چھیڑ دوں قصہ اگر بیتابیٔ دل کا
نازو والیٔ خیرپور سندھ	دن کو چین آتا نہیں راتوں کو نیند آتی نہیں	خاک اس جینے پہ ایسی دل لگی بھاتی نہیں
رافت سرہندی	گور میں بھرتا ہے نعرہ ۔ تیرا بسمل آہ کا	پڑھ کے بخش اسکو ثواب اے ماہ بسم اللہ کا
بنو	موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا ورنہ	تو نہیں ہے تو نہیں زیست گوارا مجھکو
مس گوہر جان	جاتی نہیں یہ جان نہ آتی ہے مجھ کو کل	کیسی یہ چوٹ ہے مرے دل پر لگی ہوئی
نامعلوم	کبھی زندہ کبھی مُردہ ہیں جب سے تیری فرقت ہے	قیامت ایک سُنتے تھے یہاں ہر دم قیامت ہے

موسم ہو کوئی اس کو دھڑکنے سی کام ہے — پارہ بھرا ہوا ہے۔ دلِ بے قرار میں — نامعلوم

برق کی صورت تڑپیئے۔ لوٹیئے دل کی طرح — شمع کی مانند جلیئے۔ مثلِ شبنم روئیے — "

رو کے ہوئے ہیں گو کہ تحمل کی قوتیں ملو — رگ رگ تڑپ رہی ہے دلِ ناصبور کی — "

رنگ کچھ ایسا بدلتا ہے مرا بیتاب دل — ہے گھڑی آتش کا پرکالہ۔ گھڑی سیماب دل — قدرت شاہجہاں آبادی

دل مرا پھر دُکھا دیا کس نے — سو گیا تھا۔ جگا دیا کس نے — نامعلوم

چشم نے دیکھا تھا۔ یہ تو اسلیئے زاری میں ہے — دل نے کیا دیکھا تھا۔ بن دیکھے گنہگاری میں ہے — "

تلوار کا نہ زخم۔ نہ برچھی کا گھاؤ ہے — نشتر سے چبھ رہے ہیں یہ دل کا لگاؤ ہے — "

جب یہ سُنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے — کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے — جرأت

میری یہ بےچینیاں اور اُن کا کہنا ناز سے — ہنس کے تم سے بول تو لیتے ہیں اور ہم کیا کریں — اکبر الہ آبادی

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب — یا اسی طرح سے۔ سب عمر بسر کرتے ہیں — حالی

چین آتا ہی نہیں۔ دم بھر فراقِ یار میں — کب تلک تڑپا کروں میں۔ یاالٰہی کیا کروں — نامعلوم

کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں — رکھ دیا ہاتھ اُس نے دلپر تو بھی دل دھڑکا کیا — مومن

قطعہ

وہ تو کہتے ہیں رازِ دل اپنا — مت کسی اپنے یار سے کہنا — میر درد

اور یہاں دل کی بیقراری سے — رو نہ دو تین۔ چار سے کہنا

ضبطِ نالہ کو کروں ہر دم۔ کہ روکوں آہ کو — مجھ سے اب چھپتی نہیں کبتک چھپاؤں چاہ کو — رند

آج پہلو میں ہمارے دلِ ناشاد نہیں — کسکو دے آئے۔ کہاں بھول اُٹھے یاد نہیں — نامعلوم

موت آجائے الٰہی۔ کہ وہ یار آجائے — کسی پہلو دلِ مضطر کو قرار آجائے — "

تڑپا ہے کیسا کیسا دلِ بے قرار رات — گزرے کسی پہ ایسی نہ پروردگار رات — نازو والی خیر

کل سے بیکل ہوں بھلا خاک مجھے کل آئے — کل کا وعدہ تھا نہ آج آئے نہ وہ کل آئے — نامعلوم

دم بدم رونا ہمیں۔ چاروں طرف تکنا ہمیں — کیا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں — مومن

بلا ہے۔ آفتِ جاں ہے۔ پری وش ہے کہ انساں ہے — دلا وہ کیا ہے تو جس کیلیئے دن رات نالاں ہے — شہرت

بیوفائی

ذوق	رنگت ہے۔ نزاکت ہے لطافت ہے مگر حیف	اِک بوئے وفا یہ گُلِ رعنا نہیں رکھتے
"	بے مروّت۔ بیوفا۔ تو باوفا کیونکر ہوا	خود غرض۔ نا آشنا ہے۔ آشنا کیونکر ہوا
اکبر الہ آبادی	اُنہی کی بیوفائی کا یہ ہے آٹھوں پہر صدمہ	وہی ہوتے جو قابو میں تو پھر کاہے کو غم ہوتا
غالب	ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید	جو نہیں جانتے۔ وفا کیا ہے
نامعلوم	جب اتنی بیوفائی پر دل اسکو پیار کرتا ہے	تو یارب وہ ستمگر۔ باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
احسن	وفادار بن لو تم آپ اپنے مُنہ سے	مجھے یاد ہیں سب جفائیں تمہاری
ریحاں	الفت پہ جس کی ناز تھا وہ بے وفا ہوا	کیا اپنے دلمیں سمجھے تھے ہم ہائے کیا ہوا
حیا دہلوی	ضرب المثل ہے ہوتے ہیں معشوق بیوفا	یہ کچھ تمہارا ذکر نہیں ہے۔ خفا نہ ہو
داغ	کل تک تو آشنا تھے مگر آج غیر ہو	دو دن میں یہ مزاج ہے۔ آگے کو خیر ہو
"	ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں	وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں
اختر	خوئے الفت نہ جسمیں بوئے وفا	اُس کو دل دیکے کیا کرے کوئی
اکبر میرٹھی	جس گُل سے تھی اُمید چڑھائیگا لا کے پھول	گُل کر گیا چراغ۔ وہ میرے مزار کا
زار	اور کچھ۔ ہم تمہیں کہیں نہ کہیں	بے وفا تو ضرور کہتے ہیں
امیر مینائی	ہیں بڑے بیدرد یہ بُت کسکے آگے روئیے	خاک بھی ہوتا نہیں ہے آبرو کیوں کھوئیے
وحشت کلکتہ	جان دینے سے مجھے دادِ وفا تھی مطلوب	بیوفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا
ہمدم اکبر آبادی	اُمیدِ وفا اس سے ہمدم عبث ہے	کسی کا ہوا ہے نہ ہوگا کسی کا
شیخ علی حزیں	فقیرانہ صدا سنکر مری۔ درباں سے کہتے ہیں	یہ کیوں آتا ہے در پر کچھ یہاں خیرات بٹتی ہے
جبیر اکبرآبادی	وہ نگاہیں جن سے تھی مجھ کو تسلی کی اُمید	تشنۂ خوں۔ آفتِ دل۔ دشمنِ جاں ہوگئیں
نامعلوم	حُسن و وفا کا ساتھ تو اے دل ہوا نہ ہو	معشوق اُسی کا نام ہے جسمیں وفا نہ ہو

بے اعتنائی تغافل

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی	یا رب نگاہِ مست یہ کس بے خبر کی ہے	منیر شکوہ آبادی
یا نہیں دوستی کے ہم قابل	یا محبت کا کال ہے شاید	نازدالی خیرپور سندھ
اپنا یہ دعویٰ۔ نہیں دل میں کوئی تیرے سوا	اُن کا یہ الزام۔ اچھی قیدِ تنہائی ہوئی	نامعلوم
ساری دنیا سے ہم انجان بنے جن کیلئے	ہائے ہم سے وہی انجان بنے بیٹھے ہیں	رنجور عظیم آبادی
اک اک کو جانتا ہے وہ عیار بزم میں	پر جانتا نہیں تو ہمیں جانتا نہیں	تصویر دہلوی
میری جو پوچھتے ہو۔ تو دیتا ہوں اُن پہ جان	اُن کا یہ حال ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں	اکبر الٰہ آبادی
آنکھوں میں جی مرا ہے۔ اِدھر دیکھتا نہیں	مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا	میر تقی میر
سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے	بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں	یقین
تم کو خود سے نہ خیالِ دلِ ناشاد آیا	یاد آیا مرے کہنے سے تو کیا یاد آیا	نامعلوم
آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے	مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا کہ کیوں دلگیر ہے	،،
مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں	بیوفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں	ذوق
کترا کے نکل جاتے ہو۔ کیوں راہ میں ہم سے	عاشق ہیں تمہارے کوئی رہزن تو نہیں ہم	ذاکر دہلوی
جنابِ شیخ کیوں رندوں سے کتراتے ہیں رستے میں	مسلماں ہو کے رکھتے ہیں وہ شیوہ آنا کانی کا	مفتوں ،،
پینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے	غالب
آج ساقی میں نہیں۔ گو کہ مروت باقی	خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی	اسیر لکھنوی
اب اُن سے سامنا ہوتا ہے تو مُنہ پھیر لیتے ہیں	کہاں کی رسمِ الفت۔ چھوڑ دی صاحب سلامت بھی	حامد از بجیرادُن
خبر نہیں اُنہیں اس کی کہ کون آیا ہے؟	ہم اُن کی بزم میں کیا خاک آ کے بیٹھے ہیں	بسمل بھوپالی
جب ہو چکیں جفائیں تو پہچانتے نہیں	یوں بیٹھے ہیں کہ جیسے یہ کچھ جانتے نہیں	محشر لکھنوی
تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال	دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا	حسرت موہانی

بیماریٔ الفت۔ مریضِ عشق۔ طبیبِ بے پرواہ

شفق رضوی
دکھاویں تم کو کیسا عشق کا آزار ہوتا ہے
کلیجہ تھام لو گے۔ دیکھ کر بیمار کی صورت

"
اس مرض کو۔ مرضِ عشق کہا کرتے ہیں
نہ دوا ہوتی ہے جسکی۔ نہ دعا ہوتی ہے

یقین سرہندی
کعبہ بھی ہم گئے۔ نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

رفاقت
زندگی خضر و مسیحا کی۔ نہ کیوں کر ہوتی
روگ الفت کا نہ تھا۔ عشق کا آزار نہ تھا

مومن
درد ہے جاں کی عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونیکے۔ جو درماں ہوگا

تصویر دہلوی
ایسا ترے فراق میں۔ بیمار ہو گیا
میں چارہ گر کی جان کو آزار ہو گیا

مومن
عشق ان کی بلا جانے۔ عاشق ہوں تو پہچانیں
لو مجھ کو اطبّا نے۔ سودے کا خلل جانا

آتش
سعی لاحاصل مداوائے مریضِ عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں۔ گرتی ہوئی دیوار کا

رمز دہلوی
ہوئی صورت نہ کچھ اپنی شفا کی
دوا کی مدتوں۔ برسوں دعا کی

اسیر لکھنوی
نبضِ بیمار۔ جو اے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

بینظیر وارثی
طبیبوں کا احسان۔ کیوں کر نہ مانوں
مجھے مار ڈالا۔ دوا کرتے کرتے

غالب
انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اکبر الہ آبادی
ہو خیر یارب۔ اکبرِ آشفتہ حال کی
سرجن رقیب اور دوا اسپتال کی

ذوق
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

غافل مراد آبادی
بیمارِ عشق کی نہ دوا ہو طبیب سے
مر جائے یا جیئے۔ کوئی اپنے نصیب سے

امیر مینائی
کتنے بیدرد اس زمانہ کے اطبّا ہیں امیر
حال بیمار ونکا سنتے ہیں فسانے کی طرح

حسن بریلوی
دیدیا ہے سب اطبّا نے جواب
تم نہ کہہ دینا کہیں۔ ہم کیا کریں

"
مریضِ غم کی۔ نہ پوچھو حالت۔ جو تم کو ملنا ہے۔ جلد مل لو
پھری ہیں آنکھیں۔ چھٹی ہیں نبضیں۔ بتاؤں کیا تم کو حال کیا ہے

کیا جانئے کیا ہے۔ ترے بیمار کی حالت | عیسےٰ ابھی یہ کہتے ہیں کہ ہے وقت دعا کا | امیر مینائی
مرض میرے افزوں یہ ہوتے گئے | کہ عیسےٰ بھی بالیں سے روتے گئے | ،،
اُس طرف کچھ دیکھ کر رونے لگے تیمار دار | اِسطرف بیمار غم۔ کچھ کہہ کے غافل ہوگیا | نامعلوم
اُن کو کیا کام ہے مروّت سے | اپنے رخ سے یہ مُنہ نہ موڑیں گے | اکبرالٰہ آبادی
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں | ڈاکٹر فیس کو۔ نہ چھوڑیں گے | ،،
مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو اُن کے پاس | بے وفا وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس | ذوق
بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج | کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج | ،،
دیکھو مجھے عیسےٰ مرض سِل تو نہیں ہے | یہ سنگ ہے سینہ پہ مرے دل تو نہیں ہے | محمد لعل خاں ادیب گڈپوی

بیمار پُرسی - عیادت (دیکھو مسیحائی حصہ دوم)

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو | آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے | داغ
اِک بار اور میری عیادت کو آئیے | اچھی طرح سے میں ابھی اچھا ہوا نہیں | ارنج میرٹھی
جاں بلب تھا تو عیادت کو بھی آجاتے تھے | میں تو لو اور بُرا ہوگیا اچھا ہو کر ہُد | تصویر دہلوی
جئے کس تمنّا پہ بیمار غم | حسینوں میں رسم عیادت نہیں | حسن بریلوی
بہت اچھا ہوں۔ ایسی کیا ضرورت تھی عیادت کی | عدو کے ساتھ آپ آئے۔ بڑی مجھ پر عنایت کی | حمید میرٹھی
نزع کے وقت دیکھنے آئے | جائیے آپ سے خفا ہیں ہم | ازل لکھنوی
ٹھہر جائے قضا۔ آتا ہے وہ میری عیادت کو | دمِ آخر تو بل لینے دے۔ مجکو اُس ستم گر سے | ہمدم اکبرآبادی
کس وقت آپ میری عیادت کو آئے ہیں | جب حُسن چکے گلے سے اُترتی دوا نہیں | مشتری لکھنوی
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ | دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ | مومن
ہم نشیں وہ اگر آتے ہیں تو آنے دینا | یہ نہ کہنا کہیں للّٰلہ کہ حال اچھا ہے | جگر لکھنوی
آجتک صورت مریضِ غم کو دکھلائی نہیں | یہ تو اے جانِ جہاں۔ شانِ مسیحائی نہیں | قوی امروہی

بیخودی

ریاض
دل کو وہ بیخودی ہے۔ کہ کچھ بھی اثر نہ ہو
آنکھوں میں تم پھرو بھی۔ تو ہم کو خبر نہ ہو

بیخود دہلوی
بیخودی میں بھی نہیں بھولے اُسے
واہ کیا کہنا۔ ہماری یاد کا

مومن
بیخود تھے۔ غش تھے۔ محو تھے۔ دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

امیر مینائی
مجنوں سے مینے پوچھا کل حال بیخودی کا
کچھ کہہ سکا نہ مُنہ سے۔ پر زار زار رویا

"
یار ادھر بدمست۔ میں بیخود۔ تکلف برطرف
ایسی صحبت میں جو آتا ہوش کیا دیوانہ تھا

میر مہدی مجروح
کس کو معلوم۔ جان کب نکلی
محو تھے ہم تو۔ یادِ جاناں میں

اکبر الہ آبادی
عجب کیا ہے جو دونوں دن ہیں بیہوشی کے دنیا میں
چلے جب بیچ کے رخصت آئے جسدن میہماں ہوکر
قطعہ
الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے مواقع پر
کہ تا افشا نہ کردے رازِ ہستی رازداں ہوکر

غالب
سرپائے خم پہ چاہیئے۔ ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ۔ وقتِ مناجات چاہیئے

"
ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

تسلیم لکھنوی
ہجومِ بیخودی میں اب کہاں پاسِ ادب ہم کو
جو اُٹھے بیطرح اُٹھے۔ جو بیٹھے بے محل بیٹھے

نادر راز ہیمن سنگھ
شوقِ مے نے کر دیا اس درجہ مجھ کو بدحواس
محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

آتش
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اُس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

ذاکر دہلوی
بیخودی ہو۔ تو ہے آسان وصالِ محبوب
عقل اور ہوش کو۔ اک بیچ کا پردہ جانو

بیدم اکبر آبادی
خودی میں جب نہ ہو کوئی۔ تو پھر کیا خاک بتلائے
کہ حسرت کیا بلا ہے۔ آرزو کیا چیز ہوتی ہے

داغ
محو و بیخود ہو۔ نہیں کچھ دین و دنیا کی خبر
داغ ایسا دل لگانا کوئی تم سے سیکھ جائے

شاہ ظفر
دیا اپنی خودی کو جو ہمنے مٹا۔ وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں۔ اب نہ وہ پردہ نشیں۔ کوئی دوسرا اُسکے سوا نہ رہا

نازوالیٔ خیرپور سندھ
بیخودی نے کر دیا جذباتِ دل سے بے نیاز
اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہوگیا

بدمزاجی - بدزبانی

خدا نے نیک صورت دی تو سیکھو نیک باتیں بھی
بُرے ہوتے ہو اچھے ہو کے یہ کیا بدزبانی ہے — امیر مینائی

الٰہی! دیکھئے کیوں کر نباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں۔ اور بدزباں صیاد — رند

تمہاری بدمزاجی سے ہمیں کیونکر نہ خوف آئے
مثل مشہور ہے صاحب بُرے سے سب ہی ڈرتے ہیں — داغ

مجھے بھی ہر گھڑی کی بدزبانی خوش نہیں آتی
کہوں گا پھر جو میں کچھ طبع نازک پر گراں ہوگا — راجہ

اللہ رے بدمزاجی کرتا ہے عاشقوں سے
وہ گفتگو کہ جس میں الفت کی بو نہ آئے — ہوس

مجکو تو دیکھ لینے سے مطلب ہے ناصحا
بدخو اگر ہے یار۔ تو ہو۔ خوب رُو تو ہے — اکبر الٰہ آبادی

جب زبانوں پہ تم سے تو آیا
خاک پھر لطفِ گفتگو آیا — تازہ دالی خیرپور سندھ

محبت ہم نے چھوڑی جب بڑھی تکرار آپس میں
کیا کوتاہ سب جھگڑا زباتوں کی درازی نے — رشک لکھنوی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے — غالب

کم بخت بدنصیب کے ہمراہ تو بھی ہے
دو حرف بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے خطاب میں — راسخ دہلوی

تم کو ذرا سی بات کی برداشت ہی نہیں
ایسا اکھل کھرا بھی ہے۔ کس کام کا مزاج — داغ

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی — غالب

بات کا زخم ہے تلوار کے زخموں سے سوا
کیجئے قتل مگر مُنہ سے کچھ ارشاد نہ ہو — داغ

حیف کی جا ہے نہ ہووے نرم و چرب ایسی زباں
پرورش پایا ہوا۔ یہ آدمی ہے شیر کا — آتش لکھنوی

فطرت کو ناپسند ہے سختی زبان میں
پیدا ہوئی نہ اس لئے ہڈی زبان میں — حبیب

غیر اپنے ہوں گے۔ شیریں ہو اگر اپنی زباں
دوست ہو جاتے ہیں دشمن تلخ ہو جس کی زباں — ذہین

نہ کر اے تجمل خوش سخن کسی بدزباں سے برابری
نہیں خوب بلبلِ خوشنوا۔ جو چمن میں ہمسرِ زاغ ہو — تجمل لکھنوی

ارے کہہ کے بولے تو کی عرض میں نے
یہ آدابِ اہلِ جہاں تو نہیں ہے
توجھنجھلا کے بولے ارے تیری عزت
جہاں ہو وہاں ہے یہاں تو نہیں ہے — نامعلوم

بے بسی۔ بے کسی۔ مجبوری (دیکھو عشق پڑ دو رنہیں ہے)

نامعلوم
کون ایسا ہے بھلا اُس کا جگر دیکھیں تو
یار ہو سامنے۔ دیکھے نہ اُدھر۔ دیکھیں تو

امیر مینائی
اُٹھائے ہیں مجنوں نے لیلےٰ کی خاطر
شُترِ غمزۂ ساریاں۔ کیسے کیسے

بیخود دہلوی
دستِ صیاد میں ہوں خاک اڑوں کیا بولوں
قینچی گردن میں جدا چنگی میں منقار جدا!

صفی امرہی
میں اُڑ نہ جاؤنگا لے کر ترا قفس صیاد
جو پھڑ پھڑاؤں ذرا بھی۔ تو پر کتر لینا

اکبر الہ آبادی
دل کو خود چھیڑے جو وہ ترچھی نظر تو کیا کروں
چین سے رہنے نہ دے دردِ جگر۔ تو کیا کروں

"
لذّت چاہو تو۔ وصلِ معشوق کہاں
شوکت چاہو۔ تو زر کا صندوق کہاں
کہتا ہے یہ دل۔ کہ خود کشی کی ٹھہرے
خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں
رباعی

رسا رامپوری
دل کے ہاتھوں سے یہانتک ہے پریشانی مجھے
غیر سے کہنا پڑا ہے۔ رازِ پنہانی مجھے

شوکت دہلوی
تھی عار جن کے نام سے۔ کی اُن کی التجا
لگ جائے آگ۔ اس دلِ خانہ خراب کو

مومن
کیونکر کہیں پھر منّتِ اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

نامعلوم
آئے تھے اُس سے کہکے نہ آئینگے اب کبھی
لو آج پھر بغیر بلائے چلے گئے

میر انیس
کارِ ذاتی میں ہیں عاجز۔ پاکبازانِ جہاں
گرد اپنے منہ کی پانی آپ دھو سکتا نہیں

نامعلوم
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا۔ ہم ناتواں دیکھا کئے

عیاں میرٹھی
ارے صیاد مجبوری اِسی کا نام ہے شاید
نشیمن سے دھواں اُٹھے قفس میں بیٹھے ہم دیکھیں

میر تقی میر
ہائے رے زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

نامعلوم
غمِ صیّاد و فکرِ باغباں ہے
دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

ذوق
بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خُمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مُہر ہے مُنہ پر لگی ہوئی مُرد

نامعلوم
بال و پر ٹوٹے ہوئے۔ پرواز کی طاقت نہیں
تاک میں صیاد اور گلشن کی دیواریں بلند

میر ممنوں
تاریک شب رہِ پُر خطر کوئی نہ یار و راہ بر
دیکھیں کہ ہم بے پا و سر کرتے ہیں اب منزل کہاں

بیکسوں کا والی و کارساز خدا ہے (دیکھو تسلی دلاسا)

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب	کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے	غالب
بیکسوں کی قبر پہ قدرت سے ساماں ہوگیا	چند جگنو مِل کے جب چمکے چراغاں ہوگیا	ہوش بلگرامی
زباں ہے ناتوانی سے اگر بند	مرے دل پر نہیں معنی کے در بند	اکبر الٰہ آبادی
ہماری بیکسی کب تک چھُپے گی	خدا پر تو نہیں راہِ خبر بند	
خدائی تیری ہے۔ ہم بھی ہیں اے خدا تیرے	مصیبتوں میں پکاریں کسے سوا تیرے	"
جب خدا ہو نا خدا اپنا تو بیڑا پار ہے	ورنہ ہم بیکس کہاں اور صورتِ ساحل کہاں	حامد لکھنوی
کہنے کو یوں جہاں میں۔ ہزاروں ہیں یار دوست	مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست	نامعلوم

بے رنج گنج نہیں ملتا (دیکھو تدبیر)

جی چھوڑ بیٹھے مرد۔ یہ ہمت سے دُور ہے	قسمت تو ہر طرح ہے۔ پہ محنت ضرور ہے	نامعلوم
نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا	سَو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا	"
رنج اُٹھا کر ہم نے پایا طالعِ مسعود کو	ٹھوکریں کھا کھا کے پہنچے منزلِ مقصود کو	"
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا	یہ تماشا حباب میں دیکھا	میر فضل علی
بے مشقت نہیں ہوتی کوئی راحت حاصل	غرقِ دریا ہوا غواص۔ تو گوہر پایا	اسیر لکھنوی
شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی	بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں	اکبر الٰہ آبادی
آدمی پہلے محبت میں بگڑ لے تو بنے	جب ملے خاک میں دانہ تو شگوفہ نکلے	نامعلوم
کھو گئے جب ترا مکاں دیکھا	مٹ گئے جب ترا نشاں دیکھا	نازو الی خیر
بقا کی گر تمنا ہے۔ تو جی ہی جی میں مر پہلے	ابھی ہوتا ہے وصل اُسکا۔ تو ہستی سے گزر پہلے	نامعلوم
سُرخرو ہوتا ہے انساں آفتیں آنے کے بعد	رنگ لاتی ہے حنا۔ پتھر پہ پس جانے کے بعد	"

بُرے وقت کا کوئی ساتھی نہیں

اے رشکؔ مصیبت میں کوئی بھی نہیں اپنا — اپنا نہیں جب اپنا۔ بیگانے کو کیا کہیے — رشک والئ رامپور

دے ساتھ وقتِ بد میں کون ایسا آشنا ہے — ہے قابلِ پرستش۔ جو یارِ باوفا ہے — ذہین

دلوں میں اُلفتِ باہم کا۔ دم تک جوش ہوتا ہے — مرے کا تو جنازہ بھی وبالِ دوش ہوتا ہے — مفتوں دہلوی

اپنے بیگانے کی کھلتی ہے حقیقت اس سے — کھرے کھوٹے کی کسوٹی ہے مصیبت کیا ہے — خلیق

عیش کے یار تو اغیار بھی بن جاتے ہیں — دوست وہ ہیں جو بُرے وقت میں کام آتے ہیں — نامعلوم

مصیبت میں آنکھیں کھلیں اب تو دیکھا — چھپاتے ہیں مُنہ مہرباں کیسے کیسے — بینظیر شاہ وارثی

آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں — سچ ہے کہ بیکسی میں کوئی آشنا نہیں — درد

مصیبت کا کوئی ساتھی نہیں سب چھوڑ دیتے ہیں — زمانہ پھر گیا تو پھر گیا وہ بے مروّت بھی مُرد — حامد حسین قادری

یار و غمخوار ہیں دنیا میں بنی کے ساتھی — جب بگڑتی ہے۔ تو سب آنکھ چُرا جاتے ہیں — بیخود دہلوی

مشکل میں کب کسی کا کوئی آشنا ہوا — تلوار جب گلے سے ملی سر جدا ہوا — شاد لکھنوی

رفیقِ حال بُرے وقت میں نہیں کوئی — شریکِ جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں — آتش

بُرا ہوتا ہے وقتِ بد۔ خدا ہرگز نہ دکھلائے — عدو تو غیر ہے۔ اپنا بھی اپنا ہو نہیں سکتا — ظہیر دہلوی

بُرے وقت کا کب کوئی آشنا ہے — زمانہ اُدھر ہے۔ جدھر کی ہوا ہے — نامعلوم

ایک ذرّہ کو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم — بُت جو پھر جاتے ہیں۔ اللہ پھرا ہوتا ہے — وزیر لکھنوی

نہ ہمدم کوئی ہے۔ نہ اب ہمنشیں ہے — بُرے وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہے — جرأت

جیتے جی کے آشنا ہیں پھر کسی کا کون ہے — نام کے اپنے ہوا کرتے ہیں۔ اپنا کون ہے — نامعلوم

دوستی کا جو کیا کرتے ہیں۔ دعوائے احباب — وقت پڑتا ہے۔ تو سب آنکھ چُرا لیتے ہیں — اکبر الٰہ آبادی

مجکو دیکھا ہے مُصیبت میں تو اب آتے نہیں — اپنے وعدوں سے ستم ایجاد شرماتے نہیں — نامعلوم

بنی کے چہرہ پہ لاکھوں نثار ہوتے ہیں — بنی بگڑتے ہی دشمن ہزار ہوتے ہیں — ؍؍

بغض و حسد۔ کینہ

بُغض وحسد کا حال یہ ہے جل مرے وہیں ۔ دیکھا کسی کا باغ جو پُھولا پھلا ہوا ۔ رافت اندوری

آتشِ رشک وحسد سے جل گئے میرے عدو ۔ جب مرا نخلِ تمنا بارور ہونے لگا ۔ قلندر گڈھپوری

فساد و بغض سے رکھ پاک صاف دل اپنا ۔ بُرا ہے عیب اگر جرم ہو نگینے میں ۔ میر نفیس

آزاد ترے۔ سینہ میں کینہ نہیں رکھتے ۔ جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں رکھتے ۔ نامعلوم

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا ۔ جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا ۔ ناسخ

دل کی کدورتیں نہیں چھپتیں چھپانے سے ۔ مجھ سے گلے ملے بھی تو مُنہ پھیر کر ملے ۔ قیصر دہلوی

دل کے کینہ کا پتہ دیتی ہے وہ ٹیڑھی نظر ۔ صاف جب ہو جائینگے۔ سیدھی نظر ہو جائیگی ۔ ״

کیا کہیں خاک کہیں کینہ وروں نے مارا ۔ جان کر سیدھا سا بیچارہ مسلماں ہم کو ۔ نامعلوم

اُلجھتیں جو زلفیں تو سلجھاتے اے بُت ۔ گرہ پڑ گئی دل میں مشکل یہی ہے ۔ منیر شکوہ آبادی

بغض و حسد حرام ہے۔ اپنے طریق میں ۔ ملنا عدو سے جاں سے بھی ہے دوستانہ فرض ۔ صبا لکھنوی

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں ۔ اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں ۔ ذوق

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو۔ تو ہے یہ تیری خوبی ۔ کہ جو تو نہ خوب ہوتا۔ تو وہ کیوں حسود ہوتا ۔ ״

رباعی

حاسد کیلئے ہے۔ دوزخ اس کا سینہ ۔ جلتی ہے جہاں۔ آتشِ بغض و کینہ ۔ ارشاد
دل صاف ہو حاسد کا ہے مشکل ارشاد ۔ کب صاف دھوئیں میں ہے رہا آئینہ

ہمیشہ قلب رکھتا ہوں صفا گردِ کدورت سے ۔ یہی مدِ نظر ہے۔ دل کسی کا بھی نہ میلا ہو ۔ ذاکر دہلوی

صاف و شفاف مصفا دلِ بے کینہ رہے ۔ کم نہ ذرہ ہو وہی الفتِ دیرینہ رہے ۔ نامعلوم

آگے ہر دوست کے اس طرح صفا سینہ رہے ۔ جس طرح سامنے آئینہ کے آئینہ رہے ۔ ״

صاف وہ ہے تو صفا آئینہ دکھلائے گا
اُس میں جو ہے۔ وہی اس میں بھی نظر آئے گا ۔ ״

بُت - بُت خانہ

اکبر الہ آبادی	تیار تھے نماز پہ ہم - سُن کے ذکرِ حور	جلوہ بُتوں کا دیکھ کے - نیت بدل گئی
،،	سب ہو چکے ہیں - اُس بُتِ کافر ادا کے ساتھ	رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ
بینظیر شاہ وارثی	بتو میں اور جاؤں سوئے کعبہ	خدا میرے تمہارے درمیاں ہے
ریاض خیرآبادی	لے نہیں سکتا ہوں میں بھولے سے بھی کعبہ کا نام	کیا خدائی ان بتوں کی - لے خدا ہو جائیگی
ازل لکھنوی	کون کافر یقین کرتا ہے	لاکھ یہ بت کہیں خدا ہیں ہم
جلیس	بے عیب کوئی ذات - خدا کے سوا نہیں	بُت تجھے مرے کی چیز مگر باوفا نہیں
ثاقب دہلوی	رنجش سے گر کہا ہو - تو ایماں نہ ہو نصیب	کافر بتوں کو کہتے ہیں عشّاق پیار سے
داغ	رکھ دیا ہاتھ مرے مُنہ پہ بتِ کافر نے	صبح اُٹھنے نہ دیا - نام خدا کا لے کر
امیر مینائی	او بندۂ بت دیکھ - خدا اور ہی کچھ ہے	بُت پردہ ہیں - پردہ میں چھپا اور ہی کچھ ہے
،،	بے دیکھے برہمن کو ہے انکار - میں حیراں	اللہ کوئی بت تو نہیں ہے - کہ دکھا دوں
سودا	ہمارے کفر کے پہلو سے دیں کی راہ یاد آوے	صنم کہتے ہیں جس کو دیکھکر اللہ یاد آوے
مومن	بت خانے سے نہ کعبہ کی تکلیف دے مجھے	مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا
رشک لکھنوی	دیکھئے اللہ کی یہ قدرتیں	سنگ سے بُت - بت سے خدا ہو گیا
اکبر الہ آبادی	ہنس دیتے ہیں بُت - سُن کے یہ اکبر کا لطیفہ	جب آپکے درشن ہوں تو پھر پاپ بھی پُن ہے
،،	اے بتو بہرِ خدا در پئے آزار نہ ہو	خیر راحت نہ سہی - زیست تو دشوار نہ ہو
غالب	گو واں نہیں - پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں	کعبہ سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
جوہر	تم تو کعبہ کے خدا تھے - پھر نکالے کیوں گئے	اے بتو کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی
داغ	کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدے	پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے
نازو ائی خیر پور سندھ	لگا نہ ماتھے پہ لپنے قشقہ - نشانِ سجدہ مٹا مٹا کر	بتوں سے کیا لیگا ناز ملکر خدا خدا کر خدا خدا کر

بتکدے میں شور ہے اکبر مسلماں ہوگیا	بیوفاؤں سے کوئی کہدے کہ ہاں ہاں ہوگیا	اکبر الہ آبادی
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانہ میں	کہ اکبر نام لیتا ہے۔ خدا کا اس زمانہ میں	،،
خیال رکھنا بتوں کا سفر میں کعبہ کے	ملیں جو راہ میں جھک کر سلام کر لینا	ناز وائی خیرپور سندھ
سخت جاں صحبت سے تیری اے ستمگر ہوگیا	بُت پرستی کرتے کرتے میں بھی پتھر ہوگیا	،،
پہنچے جو صنم خانے۔ تو دیکھے وہ کرشمے	بُت بن گئے خود بیٹھ گے ہم یادِ خدا میں	نامعلوم
بتخانہ میں بھری ہوئی خلقت خدا کی ہے	بُت بھی خدائی کرتے ہیں قدرت خدا کی ہے	عباس
توبہ کر تو اے برہمن۔ سجدہ کرتا ہے کسے	بُت جو پتھر کا بنا تھا۔ وہ خدا کیوں کر ہوا	شاہ ظفر
دھوم سنتے تھے بہت ہم بھی بتوں کی قیصر	جا کے بت خانے میں جب دیکھا تو پتھر نکلے	قیصر دہلوی
لاکھ اوج ہو پہنچے کا ہما ہو نہیں سکتا	بت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں سکتا	نامعلوم
میں ایک شرط پہ زاہد وہ بت دکھاتا ہوں	کہیں نہ پوجنے لگنا اُسے خدا کے لئے	قوی امروہی
وصف اُس بُتِ بےدیں کا بیاں ہو کیونکر	وہ رشکِ قمر اور میں ادنےٰ سا بشر	رنجور عظیم آبادی
سُو بات کی اک بات سنو یہ واعظ	رباعی مانو تو ہے دیوتا۔ نہیں تو پتھر	،،

بد طینتی

بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے	دل اچھا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بد زباں ہو کر	اکبر الہ آبادی
رفیقِ حرص و مکّاری۔ دلیری ہو نہیں سکتی	جو ہیں روباہ طینت اُن میں شیری ہو نہیں سکتی	،،
صاف ہو ہر چند پہ بد باطن۔ عزیزِ دل نہ ہو	کج نما آئینہ ہرگز دید کے قابل نہ ہو	نامعلوم
گردوں کی قسم تیری جفا سے نہیں ڈرتا	ڈرتا ہوں میں اس سے۔ جو خدا سے نہیں ڈرتا	محشر لکھنوی
سنتا ہے دلا۔ اہلِ جہاں کی یہ ہے عادت	مُنہ پر تو خوشامد کریں تحقیر پسِ پُشت	خسرو بنارسی
ہم نے تم کو خوب دیکھا ہے مثالِ آئینہ	پیٹھ پیچھے کچھ ہو تم۔ اور روبرو کچھ اور ہو	نامعلوم
کب راستی سے ہووے سبک ضعِ آشنا	سیدھا نہ ہو سکے کبھی ساغر حُباب کا	مخمور

پیغامبر- قاصد- پیام- سلام

نامعلوم	رو کے اُس شوخ سے قاصد مرا رونا کہنا	ہنس پڑے اُس پہ تو پھر حرفِ تمنا کہنا
"	اے پیک تیز رو تجھے اللہ کی قسم	دینا خطِ مریض. مسیحا کے ہاتھ میں
"	دیکھیں گے گر رقیب تو پُرزے اُڑا دینگے (رباعی)	ہرگز نہ دیں گے۔ اُس بُتِ رعنا کے ہاتھ میں
مشتاق دہلوی	ہرجائی پن سے اس کے ٹھکانے نہیں ہے دل	پھرتا خراب ہوگا۔ مرا نامہ بر کہیں
ذکی	کہنا پیام بر- کہ فراموشی ہے یہ کیا	وعدہ بھی کچھ کیا تھا۔ کسی بے قرار سے
نامعلوم	قسم پیمبر کی تجھ کو قاصد- زبانی کہیو یہ نامہ دیکر	چلو بلایا ہے بندہ پرور جواب ہم لیکے کیا کرینگے
"	قاصد چلا تو ہے- خبرِ یار کے لئے	اتنا رہے خیال کہ آنکھوں میں جان ہے
قائم چاندپوری	مرا پیغامبر طرزِ ادائے راز کیا سمجھے	خدا جانے یہ کیا بہکے وہ مستِ ناز کیا سمجھے
حفیظ جونپوری	آجتک لایا نہ نامے کا جواب	نامہ بر ہم کو ملا کیا لاجواب
خورشید	صبا کہیو پیام اتنا مرا۔ اُس یارِ جانی کو	کوئی کھوتا ہے تیرے ہجر میں اپنی جوانی کو
داغ	نہیں معلوم اک مدت سے قاصد حال کچھ اُنکا	مزاج اچھا تو ہے یا دشمن بخیر اُس آفتِ جاں کا
بیخود دہلوی	دوست کے دھوکے میں اُسنے دیدیا دشمن کو خط	نامہ بر ایسا مرا۔ آنکھوں کا اندھا ہوگیا
آتش	اے صبا جائے چمن میں۔ تو یہ کہیو یار سے	باغ میں جاکر۔ تو اے سروِ خراماں رہ گیا
مومن	بجان و دل پیام یار کی تعظیم کی ہم نے	سلام اس کا کہا قاصد نے۔ جاں تسلیم کی ہم نے
"	لکھو سلام۔ غیر کے خط میں غلام کو	بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
نامعلوم	مٹ چکے جب مٹنے والے تب پیام آیا تو کیا	دل کی بربادی کے بعد۔ اُن کا سلام آیا تو کیا
ذاکر دہلوی	بہکی بہکی آکے باتیں کر رہا ہے منہ سے وہ	نامہ بر آیا ہے اُن کا۔ کیا کہیں پی کر شراب
داغ	تو نے قاصد جو کہی دل کو لگی	یہ اُسی کافر کے منہ کی بات ہے
غالب	قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں	میں جانتا ہوں- جو وہ لکھیں گے جواب میں

صبا اُن سے تو یہ کہیو مرے سلام کے بعد	تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد	آسی غازیپوری
انتظارِ نامہ بر میں اس قدر بے ہوش ہوں	جان تن میں آگئی پیکِ قضا کو دیکھ کر	تنویر دہلوی
نہ لکھو غیر کے خط میں سلامِ شوق عاجز کو	سلام ایسی عنایت کو عنایت اپنی رہنے دو	ناظر
خط اُنکا دیکے مجھکو نامہ بر دے بیٹھا اک گالی	کہاں بیٹھے کہ یہ کیا۔ بولا پیغام زبانی ہے	امانت لکھنوی
جواب دیکھئے کب لے کے نامہ بر آئے	دھڑک رہا ہے مرا دل۔ کہ کیا خبر آئے	نسیم دہلوی
خطِ شوق دینے میں جلدی نہ کرنا	محل موقع لے نامہ بر دیکھ لینا	داغ
آج قاصد نے سُنائی ہے خبر کیا واللہ	وردِ لب۔ وردِ زباں ہے مرے اللہ اللہ	نامعلوم
خدا جانے کہاں خط پھینک کر کمبخت آیا ہے	یہ قاصد تو نہیں اُلّو کا پٹھا اسکو کہتے ہیں	بیخود دہلوی
پلٹ کے آپ تو آتا۔ اگر جواب نہ تھا	پیام بر تھا الٰہی۔ مرا شباب نہ تھا	جلال لکھنوی
الٰہی قاصد ابھی آئے کہ یہ توقع بھی ہے غنیمت	کیا گر انکار صاف اُسنے تو دل کی تسکین کیا کرینگے	نظام رامپوری
جواب انکی جانب سے دیتے ہیں ہم کو	یہ قاصد مقرر پڑھائے ہوئے ہیں	نامعلوم
قاصد نے اس انداز سے رُک رُک کے کہا حال	جیسے کہ سبق پڑھ کے کوئی بھول گیا ہو	״
مرا خط دیکے کہنا۔ اُن سے قاصد	کہ پڑھ لو اِس کو تم کچھ تو کہیں سے	جلال لکھنوی
میں آگیا ہوں۔ لو مجھے دو جو جواب ہے	ناحق اُلجھ رہے ہیں مرے نامہ بر سے آپ	نامعلوم
دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی	اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی	لطف استرآبادی
میں اگر جاؤں تو نکلے مطلبِ دل کچھ نہ کچھ	میرا جانا اور ہے قاصد کا جانا اور ہے	بدر دہلوی
اس پتہ سے ڈھونڈیو قاصد مرے دلدار کو	چشم نرگس۔ چال متوالی۔ شباب آنیکو ہے	نامعلوم
کچھ جواب اُس نے جو خط کا دیا اُلٹا سیدھا	نامہ بر نے مرے رستہ لیا گھر کا سیدھا	شاہ ظفر
دل میں ہزار شوق۔ خطِ شوق ناتمام	قاصد کمر کو باندھ کے تیار ہو چکا	نامعلوم
غصہ کے وقت اُنکو کبوتر نے خط دیا	قاصد بھی قسمتوں سے عجب جانور ملا	منیر شکوہ آبادی
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا	تھے غلط پیغام سارے۔ کون یاں تک آئے تھا	مومن
یہ نہیں کہتا کہ کھو آیا ہوں نامے کا جواب	لو کبوتر میرا کیا بیٹھا ہے اُلّو کی طرح	نامعلوم

پیری

داغ — ہوا زمانہ پیری۔ عذاب میں داخل
جوان تھے۔ تو جوانی تھی خواب میں داخل

ریاض — موت سے بدتر زمانہ آئے گا
جان سے اچھی جوانی جائے گی

انیس — اِک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہو گئے
تو ہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے

رضا — سفیدی سے بالوں کی عقدہ کھلا
کہ عمرِ دو روزہ بسر ہو گئی

انور بمبئی — جب جواں تھے تو نہ کی قدرِ جوانی ہم نے
اب ہوئے پیر تو یاد اپنا شباب آتا ہے

صفدر رامپوری — جوانی جا چکی۔ پیری بھی آئی ہو ہو
بس اب آگے قضا ہے اور میں ہوں

شمشاد غازیپوری — پیری وہ پہلوان ہے۔ جس سے لپٹ گئی
توڑے گی بند بند۔ اُسی کے جھنجھوڑ کے

شاہ ظفر — رہے پیری میں اس لئے جیتے
دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

گستاخ رامپوری — کبھی وہ دن تھے تمہارا کہیں جواب نہ تھا
اور اب تو ایسے ہو۔ جیسے کبھی شباب نہ تھا

ذوق — وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

" — لحد کو چاہیئے یوں پیر پشت خم دیکھے
سرا کو جیسے۔ تھکا اونٹ دمبدم دیکھے

مصحفی امروہی — دن جوانی کے گئے موسمِ پیری آیا
آبرو خاک ہے اب قیمتِ حقیری آیا

قیصر دہلوی — محبت شمع رویوں سے کریں اب کیا ضعیفی میں
زمانہ آگیا قیصر خدا سے لَو لگانے کا

خورشید — پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے
اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

سیماب اکبرآبادی — ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ حُسن تھا
دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

شفق رضوی — شفق دن ڈھل چکا اب تک پڑے ہو خوابِ غفلت میں
سفیدی آئی بالوں میں لبِ بام آفتاب آیا

نامعلوم — کیا گیا عہد نوجوانی کا
اُٹھ گیا لُطف زندگانی کا

چکبست لکھنوی — جب تک ہے جوانی کا عالم۔ کیا عیش کی مستی رہتی ہے
جب پیری موت کی لائی خبر پھر زہد بھی ہے اور طاعت بھی

پیری میں کس مزے کو جوانی کے روئیے	سو داغ دے گئے ہیں وہ دو دن بہار کے	نامعلوم
سبز باغِ دہر میں برگِ خزاں ہوتا نہیں	پیر ہو کر پھر بشر کوئی جواں ہوتا نہیں	"
آپ کو حضرتِ زاہد ہے عبث رنجِ شباب	آپ کے حق میں جوانی کا زوال اچھا ہے	مرزا بہادر جگر لکھنوی
جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے	بھڑکتا ہے چراغِ صبح۔ جب خاموش ہوتا ہے	شاد "
ہے پیامِ مرگ پیری۔ اب تو کر فکرِ سفر	زندگانی کی طرف سے تو جواب آ ہی گیا	زاہد سہارنپوری
کرتے ہیں شکوہ ضعف کا پیری میں ہم عبث	مارے تھے تیر ایسے ہی ہم نے شباب میں	بسمل دہلوی
ضعیفی کو دعائیں دے دلا خوش ہو بڑھاپے	کہ مالک بندگانِ پیر کو آزاد کرتے ہیں	شاد عظیم آبادی

پان

گھر بُلا کر خاطریں کیا خوب کیں مہمان کی	لاکھ نکتوڑوں سے دی ہے اک گلوری پان کی	رند
لگاوٹ کی ادا سے اُنکا کہنا پان حاضر ہے	قیامت ہے۔ ستم ہے۔ دل فدا ہے جان حاضر ہے	اکبر الٰہ آبادی
مرجائے ایک دم میں لہو تھوک کے رقیب	مُنہ میں ہمارے مُنہ سے جو اک پان لیجیے	نامعلوم
وہ ایسی ریش والے کو بھلا کب پان دیتے ہیں	جنابِ شیخ ناحق اس ہوس میں جان دیتے ہیں	اکبر الٰہ آبادی
اِس قدر اچھا نہیں ہے اجتناب	نوش کیجیے پان حاضر ہے جناب	نامعلوم
ہر طرح دل شاد ہوں مسرور ہوں	پان کھا کر آپ کا مشکور ہوں	"
کہتا نہیں کہ پان رقیبوں کو تو نہ دے	اتنا لحاظ کر۔ کہ مرے روبرو نہ دے	اسیر لکھنوی
سمجھ چکا ہوں کہ اک دن کریگا قتل وہی	گلوری پان کی دی جسنے مُسکرا کے مجھے	نامعلوم
پردہ اُٹھا کے مجھ سے ملاقات بھی نہ کی	رخصت کے پان بھیجدیئے بات بھی نہ کی	شاد دہلوی
کوئی روئے۔ کوئی پیٹے۔ کوئی اپنا سر دھنے	کھا کے ہر دم پان۔ اُن کو مسکرانا چاہیے	شہیدی
نازنینوں کے ہیں معشوق بھی نرم و نازک	چاہ پھولوں کی بہت شوق بہت پانوں ہے	"
ہزار شکر کہ ان گلرخوں کی مجلس میں	گئے جو ہم۔ تو نہ شرمندہ برگِ پان کے ہوئے	مصحفی

پریشانی (دیکھو غم و رنج - یاس - حصہ سویم الف)

شاعر	مصرع	مصرع
زیبا کوٹی	مٹ جائے بیکلی مری۔ دُور اضطراب ہو	دل لیکے جاں بھی لیلو۔ تو دُونا ثواب ہو
قائم چاندپوری	مجھ سا کوئی جہان میں۔ آشفتہ سر نہیں	ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں
اکبر الٰہ آبادی	دل اپنی ضد پہ قائم۔ وہ اپنی آن پر ہیں	جتنی مصیبتیں ہیں سب میری جان پر ہیں
داغ	عشق میں عیش کے بدلے یہ تباہی کیسی	پھنس گئی جان مصیبت میں الٰہی کیسی
نامعلوم	ہمتو سمجھے تھے کہ راحت سے بسر ہو جائیگی	کیا خبر تھی۔ یہ محبت دردِ سر ہو جائے گی
بیخود دہلوی	یہ پریشانی بھی گویا اختیاری بات ہے	بیٹھے بیٹھے دل نے جب چاہا پریشاں ہو گیا
نامعلوم	سوزِ جگر کو دیدۂ پُرنم کو دیکھئے	اِن آفتوں کو دیکھئے اور ہمکو دیکھئے
مومن	تابِ طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش	ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے
نامعلوم	چین شب کو۔ نہ دن کو راحت ہے	عاشقی کیا ہے۔ ایک مصیبت ہے
انشا	نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
سودا	چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل	پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
غالب	باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر	ہر گلِ تر۔ ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
داغ	اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر	دل خوش نہو تو کس کا تماشہ کہاں کی سیر
ذوق	افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لُطف	لپٹا پڑا ہے مردہ سا۔ گویا کفن کے ساتھ
مومن	ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے	کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسیطرح
جلیل	درد سے واقف نہ تھے۔ غم سے شناسائی نہ تھی	ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی
نامعلوم	مٹّی میں ہاتھ ملنا۔ اشکوں سے مُنہ کو دھونا	اپنا تو یہ تیمم۔ اپنا تو یہ وضو ہے
داغ	خدا دے تو دے اپنا غم ہر کسی کو	کرے پر نہ مائل کسی پہ کسی کو
رجب علی بیگ سرور	کیسی خوشی۔ کہاں کی ہنسی۔ کیسا اختلاط	ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

پشیمانی

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس	ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے	مومن
نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا	مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا	ریاض گورکھپوری
عاشق ہوئے مگر کچھ اچھا برا نہ جانا	ہم دل لگا تو بیٹھے۔ لیکن لگا نہ جانا	امیر مینائی
کہیں کیا ہمپہ جو صدمے گزرتے ہیں گزرتے ہیں	لگایا جس گھڑی دل۔ اُس گھڑی کو یاد کرتے ہیں	داغ
سرسری تھا گلۂ جور و تغافل اے جاں	تم پشیماں نہ کرو مجھ کو۔ پشیماں ہو کر	جنوں بریلوی
کیوں دلِ زار محبت کا نتیجہ دیکھا	دردِ فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا	حسن ،،
کس خوشی میں ہائے کیسا رنج پھیلا کیا کہوں	کیا خبر تھی ہنستے ہنستے وہ خفا ہو جائے گا	بیخود دہلوی
جھنجلا کے مجھ کو ذبح تو صیاد نے کیا	اب رو رہا ہے مُنہ کو قفس پر دھرے ہوئے	تعشق لکھنوی
کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ	ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا	غالب
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے	یہ جانتا اگر۔ تو لٹاتا نہ گھر کو میں	،،
بھلا تھا وہ میخانہ۔ جسمیں پڑے تھے	تھکے ہم۔ طوافِ حرم کرتے کرتے	نامعلوم
بس اسی مُنہ سے شکایت کرنے بیٹھے تھے ظہیر	خود پشیماں ہو گئے اُن کو پشیماں دیکھکر	ظہیر
معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبّت	لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبّت	ذوق
الٰہی کیا بلا ہے جی لگانا۔ میں نہ سمجھا تھا	قیامت کا ہے آنا دل کا آنا۔ میں نہ سمجھا تھا	ثاقب اکبرآبادی
کیا کہئے کس طرح سے جوانی گزر گئی	بد نام کرنے آئی تھی بد نام کر گئی	داغ
یہ جانا تھا نہ آئیں گے تو کیوں جانے دیا اُنکو	یہی اے داغ پچھتاوا مجھے آتا ہے رہ رہ کر	،،
طبیب کہتے ہیں کچھ دوا کر حبیب کہتے ہیں بس دعا کر	رقیب کہتے ہیں التجا کر غضب میں آیا ہوں دل لگا کر	،،
دنیا میں ہم جو آئے تو کیا کام کر چلے	ناحق ہم اپنے نام کو بدنام کر چلے	خان
مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی	آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا	قدرت شاہجہاں آبادی

پابندیٔ وضع ۔ خودداری

مومن	معشوق سے بھی ہمنے نبھائی برابری	واں لطف کم ہوا۔ تو یہاں پیار کم ہوا
داغ	اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی	کوئی کھچا کھچے۔ کوئی ہم سے ملا ملے
نامعلوم	مثالِ تارِ رہ و تارہ الگ ہم سب سے رہتے ہیں	ذرا چھیڑے سے ملتے ہیں ملالے جسکا جی چاہے
خلیق لکھنوی	پیس ڈالے گر زمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ	باغ عالم میں بشر مثلِ حنا ایسا تو ہو
بیخود دہلوی	عاشق ہیں مگر عشق نمایاں نہیں رکھتے	ہم دل کی طرح چاک گریباں نہیں رکھتے
"	گزر جاتے ہیں دو دو دن ہمیں بے آب و دانہ کے	قفس میں کون کھائے بیٹھکر صیاد کے ٹکڑے
داغ	مر گئے ہم تو وضعداری میں	دوستی کے نباہ نے مارا
رسوا	ہمیں یہ شرم رسوا۔ مانعِ ترکِ محبت ہے	کہیں گے خود غرض تھے چار دن کی آشنائی تھی
غالب	بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم	اُلٹے پھر آئے۔ درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
جوہری کاکوروی	ہم سرکش سے جھکیں وہ نہ جھکے گر پہلے	خم نہ ہو تیغ تو یاں جھکتا ہے کب سر پہلے
شوق لکھنوی	میں وہ بیمار ہوں احسان نہ لوں مرتے دم	خوب سمجھے ہوئے ہیں مجھ کو مسیحا دل میں
چکبست "	اظہارِ درد غیر سے کرتے ہیں بوالہوس	ہم کو دماغِ نالہ و آہ و فغاں نہیں
ذوق	نہ پکڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم	کہ بدتر ڈوب کر مرنیسے جینا ہے سہارے کا
"	احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا	کشتی خدا پہ چھوڑ دوں۔ لنگر کو توڑ دوں
داغ	میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے	جب کوئی بلانے نہیں آتا۔ نہیں جاتا
"	ہم بھی بدلے جو مزاجِ بُتِ بدخُو بدلا	سو رہے پھیر کے مُنہ اُس لئے جو پہلو بدلا
صبا لکھنوی	وضع سے عمرِ دو روزہ کو گزارے انسان	بوریا بخت سے ملجائے کہ مسند ملجائے
شہیدی	ہوں گدا پر موت سے بدتر سمجھتا ہوں سوال	بے کفن گڑتا نہ میں سلطاں سے خلعت مانگتا
سودا	تجھ گدا نے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال	گو مجھے بخت نے دارا و سکندر نہ کیا

ریاؔض توبہ نہ ٹوٹے۔ نہ میکدہ چھوٹے	زباں کا پاس رہے وضع کا نباہ رہے	ریاض خیرآبادی
صحبتِ اہلِ دُوَل سے ہمیں رغبت ہی نہیں	ہاتھ پھیلائیں کہیں جاکے یہ عادت ہی نہیں	اشک لکھنوی
اگر پاسِ حمیت ہے نہ عرضِ مدعا کرنا	خلافِ شانِ ہمت ہے کسی سے التجا کرنا	طاہر جودھپوری
مریدِ مُرشدِ ہمت ہوں میں میری طریقت میں	کفن بھی ساتھ لینا ننگ ہے دُنیائے فانی سے	عیشی
مُنہ رکھتے ہیں کیا۔ صاحبِ تاج و دیہیم	جو خاک نشینوں کے تئیں جانیں سقیم	
ہم آنکھ اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کیطرف	رباعی گر خم نہ ہو۔ ماہِ نو برائے تعظیم	نامعلوم

پارسائی۔ (دیکھو ریاکاری)

ہو کے مقروضِ مغاں کی ترک ہم نے میکشی	تنگدستی کا بھلا ہو۔ پارسا ہونے لگے	اکبر الٰہ آبادی
ایک کافر پر طبیعت آگئی	پارسائی پر بھی آفت آگئی	صمد
دکھاؤں گا تجھے زاہد اُس آفتِ دیں کو	خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا	سودا
مے نہ اُتری گلے سے جو اُس بن ٹک	مجھ کو یاروں نے پارسا جانا	مومن
مومنؔ یہ لافِ اُلفتِ تقوے ہے کیوں مگر	دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا	"
ہو گئے نامِ بتاں سُنتے ہی مومنؔ بیقرار	ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں	"
اجی شیخ جی زر سے ہے میکشی	جو مفلس ہوا پارسا ہو گیا	نامعلوم
لڑا کی اِن بتوں سے آنکھ دُنیا میں رہا جب تک	خدا کے سامنے کیا خاک بن کر پارسا جاتا	بیخود دہلوی
مری وضع نے بزمِ مے سے نکالا	کہ ساقی مجھے پارسا جانتا ہے	ناز والیٔ خیرپور سندھ
اِن صومعہ والوں کو خودداری کا دعوٰی ہے	مسجد کی طرف یارب وہ مستِ شباب آوے	ہوس
طالبِ جامِ ساقیا ہیں ہم	پر چھپا کر کہ پارسا ہیں ہم	ازل لکھنوی
پارسا بن کے ریاؔض آئے ہیں میخانہ میں	آپ بیٹھے ہیں۔ بچائے ہوئے دامن کیسا	ریاض خیرآبادی
نہ بلا کوئی غارتِ ایماں	رہ گئی شرم پارسائی کی	حالی

مائل دہلوی	گر اسی کا نام تقوےٰ ہے۔ تو مائل بس سلام	جو ہوئی حالت تمہاری جام صہبا دیکھ کر
رضا	تیرے تقوے کا میں اسوقت ہوں قائل ای شیخ	وصنم پاس ہو۔ اور تجھ کو خدا یاد رہے
امیر مینائی	امیر اس خرقہ و عمامہ کو تم رہن مے کردو	ابھی تم پر نہیں پھبتا ہے جامہ پارسائی کا
"	اُٹھاتے تھے جو قرآں کل تلک پرہیزگاری پہ	مصلّے تک گرو ہیں آج انکی بادہ خواری پر
ذاکر دہلوی	ملا ہے تم سے ملکر یہ نتیجہ آشنائی کا	بہا ہو ہو کے پانی خون اپنی پارسائی کا
تسلیم لکھنوی	پارسائی کیسی اے زاہد بتوں کے عشق میں	میں اسی کا شکر کرتا ہوں کہ ایماں رہ گیا
جلیل مانکپوری	ساری دنیا جانتی ہی جیسے ہیں حضرت جلیل	جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں
شفق رضوی	اگر بہہ جائے ہم رندوں میں رہکر خوب ہی زاہد	یہ غرّہ پاکبازی کا یہ دعوے پارسائی کا
نسیم	یہ کب تک پارسائی عاشقوں سے	محبّت ہے تو پھر ہم سے حیا کیا
رنگین اکبرآبادی	اپنے عیبوں پر نگہ کر۔ اپنے دل کو پاک کر	کیا ہوا اگر خلق میں تو پارسا مشہور ہے

پیسہ کے یار ہیں سب

گستاخ رامپوری	مجھ سے وہ کہتے ہیں انصاف سے تمہیں کہدو	زر نہ ہو پاس تو اُلفت کی ضرورت کیا ہے
نامعلوم (رباعی)	کیا کہئے کہ احباب کو کیسا دیکھا	کام آئے کبھی کوئی نہ ایسا دیکھا
	سب زر کے ہیں بے زر کا نہیں کوئی رفیق	دنیا میں جو کچھ دیکھا وہ پیسہ دیکھا
نامی شاہجہاں آبادی	ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے	یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

پردۂ غیرت۔ پردۂ دوئی

قائم چاندپوری	دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا	اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
فخری پانی پتی	رُخِ زیبائے حقیقت سے اُٹھادے پردہ	مجھے گم گشتۂ اسرار بنادے ساقی
ولی دہلوی	پردہ جبھی تلک ہی کہ پردہ میں ہے وہ شوخ	چہرہ کھلا تو راز چھپایا نہ جائے گا

پردہ

رُخ کو پوشیدہ عبث ماہ لقا کرتے ہیں
اچھّی صورت کو چھپاتے ہیں برا کرتے ہیں
رند

مُنہ چھپانا تھا تمہیں پہلے ہی روز
اب کیا پردہ۔ تو کیا پردہ کیا
نامعلوم

نئے طرز کے لقوے سے مقصدِ شرع کارفرما نہ ہو سکے گا
اُدھر جو پردہ نہو سکیگا اِدھر بھی تقویٰ نہو سکیگا
اکبر الٰہ آبادی

اپنی صورت کو کیوں چھپاتے ہو
یہ بھی چوری کا مال ہے شاید
نازؔ والیٔ خیرپور سندھ

اپنی صورت کو دکھاؤ تو یہ پردہ اُٹھ جائے
لوگ کہتے ہیں تمہیں رشکِ قمر دیکھیں تو
راوی لکھنوی

شکر پردے ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا۔ خدا نے رکھا
ذوق

اس میں کچھ راز نہیں ہے تو چھپاتے کیوں ہیں
رُخ خطِ غیر نہیں ہے کہ دکھا ہی نہ سکیں
شوق لکھنوی

لیجاؤں جب بہشت میں اُس حورِ وش کو میں
پہلے فرشتہ دور سے پردہ پکار دے
داغ

دل میں آجاؤ کہ ہے یہ گھر تو پردے کا مکاں
ہمنے آنکھیں بند کرلیں۔ آؤ پردہ ہو گیا
بیخود دہلوی

پردے والوں سے یہ خواہش کہ اُٹھائیں پردہ
اُٹھ گیا آنکھ سے اب لوگوں کی پردہ کیسا
ریاض خیرآبادی

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
قطعہ
پوچھا جو اُن سے۔ آپکا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں۔ کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا
اکبر الٰہ آبادی

یہ تو فرمائیے! ہم آپ کا کیا لیتے ہیں
آپ بیوجہ جو مُنہ ہم سے چھپا لیتے ہیں
تنہا دہلوی

لکھا ہوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا نہیں کے پردے پر
شوق
استاد ذوق

مُنہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب
کھولکر پردہ۔ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے
غالب

پردے کی کچھ حد بھی۔ اے پردہ نشیں
کُھل کے رہ بس مُنہ چھپانا چھوڑ دے
مومن

کبتک رہو گے مُنہ کو چھپائے نقاب میں
کبتک رہیگا چاند سا مُکھڑا۔ حجاب میں
تبسم مرادآبادی

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
قطعہ
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے
اقبال

تصوّر

ریاض خیرآبادی	ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہوں	ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو
حضور بھوپالی	رات کا خاموش منظر۔ اور تصور یار کا	ہے یہی اک وقتِ راحت عشق کے بیمار کا
حمید لکھنوی	شوقِ دیدار اس کو کہتے ہیں تصور نے مرے	ہر در و دیوار پر کھینچا ہے نقشہ یار کا
تسلیم عظیم آبادی	تصویر تمہاری ہے۔ یا تم ہو خدا جانے	اک عالمِ حیرت میں ہے پیشِ نظر کوئی
نامعلوم	پھر وہی بیباکیاں پہلی سی دکھلانے لگے	پھر مجھے چھیڑا۔ تصوّر میں مرے آنے لگے
جلیل	ہائے پوچھو نہ تصوّر کے مزے	گود میں تم کو لئے بیٹھے ہیں
غالب	دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
بینظیر شاہ وارثی	کون لیجائے مجھے۔ اُس ہجیر کے سامنے	رات دن رہتا ہے جو میری نظر کے سامنے
مائل دہلوی	تصوّر سے تمہارے دلکو تسکیں دے ہی لیتے ہیں	تم آؤ یا نہ آؤ کام اپنا ہو ہی جاتا ہے
بیخود ،،	وہ مجھے بھول گئے اور یہاں ہے یہ حال	ہر گھڑی سامنے آنکھوں کے ہے اُن کی صورت
مضطر خیرآبادی	دن رات تمنّا مجھے کچھ کچھ ہے کسی کی	دن رات تصوّر مجھے کچھ کچھ ہے کہیں کا
قیصر دہلوی	ملتا ہے شبِ ہجر۔ تصوّر سے سہارا	کی آنکھ اِدھر بند اُدھر وہ نظر آئے
میر تقی میر	تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
آتش	تصوّر سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں	رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں
مظہر تھانوی	تصوّر ہے کسی کا مونسِ غم	خیالِ دلربا ہے اور میں ہوں
نامعلوم	تمہاری یاد کا پتلا بٹھا کر روبرو برسوں	تصوّر میں کسی نے کی کسی سے گفتگو برسوں
قیصر دہلوی	تم کو خبر نہیں۔ کہ تصوّر میں کون ہے	ہم کیوں بتائیں کرتے ہیں باتیں کسی سے ہم
فائق از مچھلی بندر	کھینچ لیتا تھا ہمیشہ۔ دل میں تصویرِ صنم	ہجرِ جاناں میں تصوّر بھی مرا۔ بہزاد تھا
شیخ علی حزیں	جو کیں تصوّر میں بند آنکھیں تو سیر ساتوں فلک کی دیکھی	اگرچہ زانو پہ سر ہے لیکن نظر ہماری کہاں کہاں ہے

اب تصوّر سے نکل کر تم کہاں جانے لگے
تم پر آنکھیں لگ گئیں پہرا مقرر ہو گیا
نازؔ والیٔ خیرلور پنڈ

ہاتھوں کا کام آج لیا ہے نگاہ سے
آنکھوں میں رکھ کے لائے اُنہیں جلوہ گاہ سے
ریاضؔ خیرآبادی

آمد تصوّرِ بتِ بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لُوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے
منیرؔ شکوہ آبادی

بہت اچھی گزرتی ہے ترے محوِ تصوّر کی
کبھی مغموم ہو جانا۔ کبھی مسرور ہو جانا
ظہیرؔ دہلوی

تصویر

میں سمجھ کر نقشِ دفعِ اضطراب و اضطرار
دل میں رکھ لیتا ہوں اپنے یار کی تصویر کو
صبیؔ امروہی

تری تصویر میں یہ بات تجھ سے بھی نرالی ہے
کہ جتنا چاہو چمٹا لو۔ نہ جھڑکی ہے نہ گالی ہے
نامعلوم

تصویر اُن کی۔ سارے مُرقّع کی جان ہے
گویا چمن میں پھول کھلا ہے گلاب کا
جلیلؔ مانکپوری

جب بیاں کی ہے تمنّا عاشقِ دل گیر نے
کن بُری نظروں سے دیکھا ہے تری تصویر نے
بیخودؔ دہلوی

تصویر کیوں دکھائیں تمہیں نام کیوں بتائیں
لائے ہیں ہم کہیں سے کسی بے وفا کی ہے
"

آپکے کہنے سے ناصح پھینک دوں تصویرِ یار
اور دل کو دوں تسلّی۔ آپ کا سر دیکھ کر
گستاخؔ رامپوری

گر نہیں صورت دکھاتے بھیجدو تصویر ہی
خیر اسی کو ہجر میں پیشِ نظر رکھیں گے ہم
شاہ ظفرؔ

آجائے اگر ہاتھ۔ تو کیا چین سے رہیئے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ
نامعلوم

صورت چل نکلتی کسی تدبیر کے ساتھ
میری تصویر ہی کھنچتی تری تصویر کے ساتھ
جلالؔ

ہوتے رہتے ہیں پہروں راز و نیاز
رکھ کے تصویر۔ رُوبرو تیری
رفعتؔ

تو مجھ سے نہ مل خیر مجھے بھی نہیں پرواہ
ڈھب تیرے جلانے کا یہ اے یار کروں گا
قطعہ
تصویر تری لا کے میں اب سامنے تیرے
چھاتی سے لگاؤں گا اُسے۔ پیار کروں گا
امیرؔ مینائی

دلِ بیتاب کو تسکیں یونہی دے لیں گے
تو نہ دے ہم تری تصویر کے بوسے لیں گے
اخترؔ

اپنی تصویر پہ نازاں ہو۔ تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی۔ دہن غنچہ کا۔ حیرت میری
داغؔ

جب خیال آتا تھا تیرے روئے پُر تنویر کا
چوم لیتا تھا میں اُٹھ کر۔ منہ تری تصویر کا
اکبرؔ میرٹھی

توبہ

رسا	پی کے کرلیتا ہوں توبہ جب سے یہ دستور ہے	دل بھی روشن ہے مرا منہ پر بھی میرے نور ہے
نامعلوم	توبہ سو بار کروں توبہ سے ہوتا کیا ہے	زاہدا تو ہی بتا۔ رند کی توبہ کیا ہے
ریاض خیرآبادی	کیوں نہ ٹوٹے مری توبہ۔ جو کہے تو ساقی	پی لے۔ پی لے۔ ارے گھنگھور گھٹا چھائی ہے
"	چھیڑ ساقی کی ہے دیتا جو نہیں جام ریاض	توبہ کی ہے نہ کبھی ہم نے قسم کھائی ہے
غالب	میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں	گر میں نے کی تھی توبہ۔ ساقی کو کیا ہوا تھا
ریاض بدایونی	رند میخوار کو ہے اس لئے توبہ کی تلاش	کہیں ملجائے تو مُردار کے ٹکڑے کر دے
پریشاں دانا پوری	خوب اے شیخ ریاکار۔ نباہی توبہ	دل میں وہ بت ہے زباں پر ہے الٰہی توبہ
داغ	ہر گنہ سے توبہ کر لی۔ جب جوانی ہو چکی	زاہد و جنت میں جانا۔ کوئی تم سے سیکھ جائے
بیخود دہلوی	عشق کے شغل سے خالی نہ کسی آن رہے	توبہ کے بعد بھی دل میں بہت ارمان رہے
امیر مینائی	کہہ کے لبیک مغفرت دوڑے	توبہ عاصی۔ اگر کرے دل سے
آتش	توبہ کرنی ہے گناہوں سے تو کر لے غافل	ورنہ فرصت ہے دم باز پسیں تھوڑی سی
رحمت بلند شہری	گناہوں سے اگر ہم باز آئیں اور کریں توبہ	ابھی سب دور ہوں جتنی بلائیں آسمانی ہیں
حسن بریلوی	شیشہ اُٹھا کے طاق سے ہم نے	طاق پہ رکھدی۔ ساقی توبہ
بسمل دہلوی	پیری میں توبہ کرکے وہاں کے اُڑاؤ عیش	یاں کے تو عیش اُڑا چکے۔ بسمل شباب میں
"	توبہ تو ہم بھی کر لیں۔ ابھی شیخ جی مگر	جچتی ہمیں نظر نہیں آتی شباب میں
نامعلوم	تجھ کو زاہد نے نہ دیکھا۔ کہ نباہی توبہ	تُو تو وہ توبہ شکن ہے کہ الٰہی توبہ
رنج	توبہ کہاں کی۔ اور کہاں کا پھر اتقا	آیا جب اپنے سامنے ساغر شراب کا
داغ	توبہ کر زاہد کروں توبہ میں ایسے وقت میں	یہ بہار آئی ہوئی ایسی گھٹا چھائی ہوئی
نامعلوم	مے کی توبہ سے تو ہر چند نباہی توبہ	پر مغاں سے۔ یہ خجل ہوں کہ الٰہی توبہ

بات رکھ لیتے ہیں ہم ساقی و واعظ کی اثر ۔ جام بھی پیتے ہیں۔ توبہ بھی کئے جاتے ہیں ۔ اثر

دیکھنا ہے۔ لبِ توبہ کا تبسم ساقی ۔ تلخ اتنی ہو کہ مشکل مجھے پینا ہو جائے ۔ ریاض خیرآبادی

شیشۂ مے گر کے ٹوٹا۔ خیر گزری محتسب ۔ تھی بہت نازک۔ تری توبہ سلامت رہ گئی ۔ شفق عماد پوری

ساقی خدا کے واسطے درِ میکدہ کا کھول دے ۔ حاضر ہیں دو توبہ شکن اک اس طرف اک اس طرف ۔ فراق دہلوی

وہ توبہ جسکے ہاتھوں سینکڑوں جام و سبو پھوٹے ۔ ابھی تو ٹوٹ جاتی ہے کہیں مے کی جو بو پھوٹے ۔ جلال لکھنوی

قدم قدم پہ لرزتا ہے میرا تو ایماں ۔ کیا ہے توبہ نے کیسا گناہ گار مجھے ۔ نامعلوم

ہزاروں بار توبہ کی ہے میں نے بادہ نوشی سے ۔ مگر بدلی کے آتے ہی بدل جاتی ہے نیت بھی ۔ حامد حسین قادری

توبہ کا در کھلا ہے۔ گنہگاروں کے لئے ۔ آمرزگار بھی ہے وہ۔ گر ذوالجلال ہے ۔ بشیر دہلوی

ترکِ دُنیا

جو عاقل ہے اُٹھا دل سے تعلق دہرِ فانی کا ۔ دم آیا یا نہ آیا۔ کیا بھروسہ زندگانی کا ۔ اسیر لکھنوی

چھوڑ کر ہم نے امیری۔ کی فقیری اختیار ۔ بوریے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے ۔ آتش

اس خاکداں سے طبع کو ہوتا نہیں لگاؤ ۔ کس جوہرِ لطیف سے میں آفریدہ ہوں ۔ میر مجروح

رباعی

اے ذوق کریگا کوئی دنیا کیا ترک ۔ دنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک

کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا ۔ جبتک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک ۔ ذوق

ترک کر دوں اگر اپنے کو تو کامل ہو جاؤں ۔ اپنے قابل نہ رہوں تو ترے قابل ہو جاؤں ۔ نامعلوم

بہت دور ہے منزلِ دوست اے دل ۔ جو یہ طے ہوئی۔ پھر خدا ہی خدا ہے ۔ آصف والی دکن

طے ہو رہی ہے منزل جنکو کہ وقت کم ہے ۔ ملکِ فنا کی جانب ہر سانس اک قدم ہے ۔ نامعلوم

اچھی کہی یہ شیخ نے دنیا کو چھوڑ دو ۔ کیا اس کو ترک کر کے رہیں آسمان پہ ۔ ”

نہ آنا اے اجل تجھکو قسم ہے وقت آخر تک ۔ ابھی کچھ عمر باقی ہے اُسے بھی رائیگاں کر لیں ۔ ”

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو ۔ کبتک رہیگا خواب میں۔ بیدار ہو بیدار ہو ۔ ولی دکنی

ترکِ عشقِ بُتاں

رسا	کوچہ میں اِن بتوں نے رہنے دیا نہ شاید	سُنتے ہیں اب رسا بھی کعبہ کو جا رہا ہے
خورشید	ہوا حاصل یہ ہمکو۔ دوستوں کی بیوفائی سے	کہ ہم نے عمر بھر کو۔ توبہ کر لی آشنائی سے
اکبر الہ آبادی	بتکدہ میں شور ہے اکبر مسلمان ہو گیا	بیوفاؤں سے کوئی کہدے کہ ہاں ہاں ہو گیا
مومن	نام اُلفت کا نہ لونگا جب تلک ہے دم میں دم	تو نے چاہت کا مزہ اے فتنہ گر دکھلا دیا
،،	رکھ لیویں گے پتھر۔ مگر ان سنگدلوں کو	چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے
نامعلوم	روز دل پر زخم کب تک کھائینگے	سیر ہی کرنے سے اب باز آئینگے
مومن	اے حضرتِ مومن۔ مسلّم ہے جو ارشاد	بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے
قطعہ	لیکن جو بتوں نے ہی۔ بھلا آپ سے کی بات	پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے
نامعلوم	دل زمانہ سے ہٹ گیا اپنا	ہم بھلے۔ اور گھر بھلا اپنا
جلیل	سختیِ عشق اٹھانے کا زمانہ نہ رہا	ابتو ہے بھول بھی پتھر ترے دیوانے کو
داغ	وہ دن گئے کہ داغ تھی ہر دم بتوں کی یاد	پڑھتے ہیں پانچ وقت کی اب تو نماز ہم
امیر مینائی	الٰہی وہ بھی دن آئے کہ وہ بت مجھکو بلوائے	کہوں میں ایکدم فرصت نہیں یادِ الٰہی سے
حالی	ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی	جی چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
شاکر میرٹھی	کیونکر کہوں۔ ہے ترکِ محبّت کا ارادہ	کیوں آئے زباں پر جو مرے دل میں نہیں ہے
قیصر دہلوی	دل میرا بس میں آ کے کسی کے نکل گیا	ٹھوکر تو میں نے کھائی تھی لیکن سنبھل گیا
قائم چاندپوری	مر جائیے کسی سے پہ الفت نہ کیجیے	جی دیجیے تو دیجیے۔ پر دل نہ دیجیے
داغ	اچھی صورت کی رہا کرتی تھی اکثر تاک جھانک	رہ گئیں آنکھیں۔ مگر وہ دیکھنا جاتا رہا
جوہر رامپوری	جوہر اس ایک دل کے لئے اتنے مشغلے	کی ہے خدا کی چاہ۔ تو عشقِ بُتاں نہ ہو
میر ممنون	سو بار ہوں میں کہہ چکا۔ خوبوں سے مت مل ہی بُرا	لیکن سمجھتا ہے بھلا اپنا دلِ جاہل کہاں

تسلّی - دلاسا (دیکھو بیکسوں کا والی خدا ہے)

کام رُک سکنے کا نہیں اے دلِ ناداں کوئی	خود بخود غیب سے ہو جائیگا۔ ساماں کوئی	داغ
مصیبت جس سے زائل ہو وہی سامان کردیگا	نہ گھبرانا۔ خدا سب مشکلیں آسان کردیگا	شاد
ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا	تسلّیاں مجھے دے دیکے بیقرار کیا	داغ
وہ گھبرا کے دیتے ہیں جس دم تسلّی	ہنسی اُن کے رونے پہ آتی ہی کیا کیا	بیخود دہلوی
ہو نہ بیتاب۔ غمِ ہجرِ بتاں میں مومن	دیکھ دو دن میں۔ بس اب فضلِ خدا ہوتا ہے	مومن
قلق اور دل میں سوا ہو گیا	دلاسا تمہارا بلا ہو گیا	حالی
دے کر مجھے تسلّی۔ بے چین کر رہے ہو	ہنستے ہو وعدہ کر کے قربان اس ہنسی کے	رسا
ہونا ہے جو۔ وہ ہوگا۔ کیوں رنج کر رہا ہے	ہے عمر تیری کتنی۔ کیوں غم میں مبتلا ہے	ذہین
خلق تجھ سے بیخبر ہے۔ تُو خبر خالق کو تو	تار برقی گر نہیں ہے۔ آنسوؤں کا تار باندھ	اکبر الٰہ آبادی
یار کے ذکر سے ناصح نے لگائی اور آگ	یارب آیا تھا تسلّی کو۔ کہ تڑپانے کو	امیر مینائی
ارمان نکل جائیں۔ کچھ عاشقِ مضطر کے	آنسو نہ مرے پونچھو۔ رو لینے دو جی بھر کے	نسیم دہلوی
میں تو زندہ ہوں تمہیں کیوں فکر کیوں تشویش ہے	مرگیا دشمن تو میری جان مرجانے بھی دو	قیصر ״
مایوس نہ ہو کوئی زمانے میں خدا سے	ہونے کیلئے غیب کے سامان بہت ہیں	نامعلوم
دِل دلاسوں سے کرے ہے آہ وزاری بیشتر	خانۂ ماتم میں ہو۔ پُرسے سے زاری بیشتر	حسن دہلوی
مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح	مرے مُنہ کو کب تک تو دھوتا رہیگا	میر تقی میر
کم سے کم اس آہ وزاری کا اثر اتنا تو ہو	آکے آنسو پونچھ دیں وہ چشمِ تر اتنا تو ہو	وجاہت جھنجھا
تسلّی مرے دل کو کیا دے رہے ہیں	کلیجے میں وہ چٹکیاں لے رہے ہیں	داغ
اے دلا جلدی نہ کر۔ گر تجھ پہ غم کی رات ہے	وہ ہی دن آجائینگے وہ چار دن کی بات ہے	نامعلوم
اُلجھن سی یکایک ہوتی ہے دم رکتا۔ دل بھر آتا ہے	جب کوئی تسلّی دیتا ہے کچھ اور بھی جی گھبراتا ہے	״

تقدیر

خاطر
تقدیر کی ہے بات۔ جواب بھی نہ ہو قبول
آمین کہہ رہے ہیں وہ میری دعا کے ساتھ

اکبر الہ آبادی
"بی اے" بھی پاس ہوں ملے بی بی بھی پسند
محنت کی ہو وہ بات۔ یہ قسمت کی بات ہے

بیخود دہلوی
قابلِ رشک ہے اُس شخص کی قسمت یارب
جس کے قابو میں ہو دل پاس ہو دلبر اپنا

رسا گیاوی
رہے ہر حال میں۔ تقدیر پہ شاکر انسان
سب بنے کام بگڑ جاتے ہیں گھبرانے سے

صبا لکھنوی
لکھے کی کیا خبر تھی۔ یہ کون جانتا تھا
لیلےٰ کے ساتھ پڑھ کر مجنوں خراب ہوگا

صبی امروہی
میری قسمت میں نہ لکھا ایک بھی حرفِ وصال
دشمنی تھی کب کی مجھ سے کاتبِ تقدیر کو

مومن
دربدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

ریحاں
ہر طرح کے کام میں تائیدِ خالق چاہیئے
ہم مقدم سمجھے ہیں۔ تدبیر پہ۔ تقدیر کو

مفتوں دہلوی
جن کو مل جائیں حسیں چاند سی صورت والے
ایسے بھی ہوں گے چمکتی ہوئی قسمت والے

ذوق
رزق خود اُڑ کے پہنچتا ہے جو تقدیر کا ہو
پر دیئے ہیں مرے رزاق نے ہر دانے کو

ظفر سہارنپوری
ہوگا وہی ازل سے ہے قسمت میں جو لکھا
قائل کسی شگون کے ہم ہیں نہ فال کے

آتش
ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو
مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا

نامعلوم
مٹ نہیں سکتا مٹانے سے لکھا تقدیر کا
بس نہیں چلتا ہے کچھ۔ تقدیر پہ تدبیر کا

تقدیر سب کی الگ الگ ہے

نامعلوم
عاشق معشوق اک ہی خاک سے پیدا ہوئے
یہ بھی قسمت ہے۔ کوئی لیلےٰ کوئی مجنوں ہوا

درخشاں
حال اَبنائے زماں ہے مثلِ سنگِ آسیا
ایک ہے آرام سے۔ کھاتا ہے چکر دوسرا

نامعلوم
ہو ایک مرا عشق۔ ترا حسن پر افسوس
کھلنے میں ہو یہ عیب وہ چھپنے میں حیا ہو

,,
ہمنے پھولوں کو چھوا مرجھا گئے کانٹے ہوئے
تم نے کانٹوں پر قدم رکھا گلستاں کر دیا

تدبیر (دیکھو حوصلہ ہمّت)

پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو — صاحبِ ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو — راضی

چل نہیں سکتا ہے کچھ بس چارہ گر تدبیر کا — مِٹ نہیں سکتا کبھی لکھّا ہوا۔ تقدیر کا — قمر بٹالوی

نصیبہ جب مرا اچھّا تھا اور تقدیر اچھی تھی — مری ہر بات اچھی تھی ہر اک تدبیر اچھی تھی — شاہ ظفر

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو — سوزنِ تدبیر ساری عمر۔ گو سیتی رہے — زکی

لاکھ صورت سے کیجئے تدبیر — ہوگا لکھا ہے جو مقدّر کا — شوکت میرٹھی

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر — انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز — اکبر الہ آبادی

کشتہ ہوں میں فراق کا اکسیر کیا کرے — تقدیر میں شفا نہیں۔ تدبیر کیا کرے — امیر مینائی

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا — میر تقی

نہیں چلتا کسی کا بس کریں گو لاکھ تدبیریں — وہی بات آئیگی آگے جو قسمت میں لکھی ہوگی — شاد

رباعی

باپ سے مانگو نہ عشرت۔ نہ چچا سے مانگو — سعیِ بازو پہ کرو تکیہ۔ خدا سے مانگو
حُسنِ تدبیر بڑی چیز ہے۔ اِس دنیا میں — مدد اس کام میں تم۔ عقلِ رسا سے مانگو — اکبر الہ آبادی

کام سب تقدیر پر ہیں۔ ہے مگر تدبیر شرط — کچھ سبب بھی چاہئے۔ اِس عالمِ اسباب میں — نامعلوم

جس میں کوشش ہو سوا کام بگڑتا ہے وہی — دشمنی ہے مری تقدیر کو تدبیر کے ساتھ — بیخود دہلوی

رباعی

قسمت کا گلہ۔ فلک کا شکوہ کب تک — غیبی امداد کی تمنّا کب تک
جس ہاتھ سے کر سکتے ہو سب کچھ ضامن — اُس ہاتھ کو سر پہ رکھ کے رونا کب تک — ضامن

بل بے اندھیر نہیں سوجھتی راہِ قسمت — ہاتھ پکڑے ہوئے تدبیر لئے پھرتی ہے — نامعلوم

کہیں ملتی نہیں بیماریٔ قسمت کی دوا — زندگی نسخۂ تدبیر لئے پھرتی ہے — "

نہ کچھ عقل نے۔ اور نہ تدبیر نے — رکھا مجھ کو معذور تقدیر نے — "

میں کہتا تھا۔ انساں کی اگر تقدیر نہیں تو کچھ بھی نہیں — ہمت بڑھکر بول اُٹھی۔ تدبیر نہیں تو کچھ بھی نہیں — طالب بنارسی

تقدیر کی گردش

نامعلوم	مجھ سے بن بن کے بگڑتا اُس بُتِ بے پیر کا	سب کرشمہ ہے مری بگڑی ہوئی تقدیر کا
ہمدم اکبر آبادی	گلہ کچھ آسماں سے ہے نہ شکوہ اس ستمگر سے	شکایت ہے اگر مجھ کو تو اس چھوٹے مقدّر سے
قوی امروہی	کیا تم سے شکایت۔ مجھے قسمت سے گلہ ہے	پھرتا ہے مقدّر۔ تو پلٹتی ہے نظر بھی
چکبست لکھنوی	یوں نہ انسان کا برگشتہ مقدر ہوجائے	میں اگر پھول اٹھاؤں تو وہ پتھر ہوجائے
آتش	موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے	ڈوبنے جاؤں۔ تو دریا ملے پایاب مجھے
	میری ایذا کے لئے مُردے میں جان آتی ہے	کاٹنے دوڑتی ہے۔ ماہیِ بے آب مجھے
تسلیم لکھنوی	بخت برگشتہ ہے اچھی بھی بُری ہو جائے گی	دوستی جس سے کرینگے۔ دشمنی ہوجائے گی
نامعلوم	راحت طلب کروں تو ملے آسماں سے رنج	حاضر ہو موت ابھی جو خیال آئے خواب کا
حسرت شاہجہانپوری	برنگِ آبلہ۔ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے	کہ جیسے پاؤں پڑتے ہیں اُسی کو سر گرانی ہے
داغ	قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند	دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا
نامعلوم	قسمت کو دیکھئے کہ کبوتر کا گر پڑا	وہ پر کہ جس میں تھا مرا نامہ بندھا ہوا
"	بلا کسی کی طرف آئے رُخ ادھر ہوگا	نشانہ ہوں گے ہمیں تیر جس کماں سے چلے
"	خوب امیدیں بندھیں لیکن ہوئیں حرماں نصیب	بدلیاں اُٹھیں۔ مگر بجلی گرانے کے لئے
غالب	کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل	انسان ہوں۔ پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
جوہر منشی جواہر سنگھ	غبار کی طرح ملی۔ باغِ جہاں میں تقدیر	جس سے لپٹوں وہ چھڑا لیتا ہے دامن اپنا
حسن بریلوی	ہم ہیں وہ برگشتہ قسمت جانِ من	تم تو کیا منہ پھیر لے تلوار تک
حسرت شگفتہ	مری تقدیر کی گردش کی شکایتیں ہیں جداگانہ	بھنور ہوں بحرِ اُلفت میں بگولہ دشتِ غربت میں
غالب	حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب	جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
ذوق	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ	ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

تقدیر سے مفر نہیں

پھوٹیں اگر نصیب تو دل کس جگہ چھپائیں
پتھر پڑیں تو جا کے کہاں شیشہ گر رہے — نامعلوم

کوئی نعمہ جو کبھی ہم کو میسر آیا
ساتھ ہی دانت کے نیچے کوئی کنکر آیا — بسمل دہلوی

نہ ملیوں گیسوؤں والوں سے یہ مانا میں نے
اور قسمت میں جو لکھا ہو۔ پریشاں ہونا — نامعلوم

تقدیر ہمیشہ ہی رہی وقفِ مقدر
کیا کیا نہ کیا سوچ کے۔ کیا کیا نہ سمجھ کر — ''

کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دُور دُور کی — اکبر الہ آبادی

توکل رضائے الٰہی

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اُٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو — اکبر الہ آبادی

دل مرا بندۂ تسلیم و رضا ہو جائے
یا الٰہی مری مقبول دعا ہو جائے — ہاتف بھوپالی

گر نہ ہو حاصل کسی سے مدعا۔ بیدل نہ ہو
آدمی کو ربِ اعلیٰ پر توکل چاہیئے ہر د — جوہر جواہر سنگھ

خواہشیں اپنی فدا کر دے رضائے دوست پر
پھر میں دیکھوں چاہنے والے کا چاہا کیوں نہ ہو — حسن بریلوی

آرام سے ہوں۔ فقر کے بستر پہ ہیں گدا
تکیہ ہے جب سے رازقِ مطلق کی ذات پر — امیر مینائی

فقیر اللہ کے ہیں۔ بوریائے فقر ہے بستر
توکل پر نظر۔ تکیہ ہے اپنا۔ ذاتِ باری پر — ''

فقیروں میں ہیں گو لیکن کسی در پر نہیں جاتے
توکل کا ہے تکیہ آشنا ہیں اپنے بستر کے — خاموش بھوپالی

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو۔ تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ — جوہر رامپوری

ہے سُنتِ اربابِ وفا۔ صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ — ''

تدبیر سے تو کام۔ نہ تقدیر کا ہوا
تکیہ خدا پہ کیجئے۔ دروازہ بھیڑیئے — آتش

جو مل گیا۔ وہ کھانا۔ داتا کا نام جپنا
اس کے سوا بتاؤں۔ کیا تم سے کام اپنا — اکبر الہ آبادی

ہماری کشتیٔ امید چلتی ہے توکل پر
سہارا ناخدا کا چاہیئے اسکو نہ لنگر کا — نامعلوم

جو ہونا ہے وہ ہوتا ہے جو ہونا ہے وہی ہوگا
گھٹائیں کیوں خوشی اپنی بڑھائیں کیوں محن اپنا — بازغ

تذبذب۔ کشمکش

شاعر	مصرع اول	مصرع ثانی
داغ	وہ جو بولیں۔ تو بات جاتی ہے	چپ رہوں میں تو رات جاتی ہے
نامعلوم	دل یہ کہتا ہے کہ اظہارِ تمنّا کیجیے	عقل کہتی ہے کہیں آئی ہے شامت تیری
گستاخ رامپوری	شوق کہتا ہے کہ چلئے۔ کوئے جاناں کی طرف	ہے یہ ارشادِ جنوں۔ بڑھئے بیاباں کی طرف
نامعلوم	واعظ و ساقی میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے	لب پہ توبہ اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے
غالب	اُدھر وہ بدگمانی ہے۔ اِدھر یہ ناتوانی ہے	نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے
نامعلوم	اِدھر سے تقاضا۔ اُدھر سے تغافل	عجب کھینچا تانی میں پیغام بر ہے
نازوائی خیرپور سندھ	مجھ سے بھی ہے اقرار۔ عدو سے بھی ہے وعدہ	کیا جانے کہاں جائینگے۔ نیت ہی کدھر کی
جلیل	نامہ ابھی لکھا نہیں۔ قاصد گیا نہیں	لیکن اُمید و یاس میں جھگڑا ابھی سے ہے
نامعلوم	عشق کی منزل کڑی ہے۔ رہنما ملتا نہیں	محوِ حیرت ہم کھڑے ہیں۔ راستہ ملتا نہیں
قدرت شاہجہاں آبادی	دلِ پُر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے	دستِ امید ہے اور دامنِ مایوسی ہے
نامعلوم	کشمکش میں ترے بیمار کی جان آئی ہے	دیکھئے معرکہ اب کسکے یہاں ہاتھ رہے
(ق)	ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لیکے ٹلوں	سربسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے
،،	شب ہے تھوڑی یار جانیکو ہے۔ اے دل کیا کروں	وصل کی باتیں کروں یا ہجر کا شکوہ کروں
غالب	ایماں مجھے روکے ہے۔ جو کھینچے ہے مجھے کفر	کعبہ مرے پیچھے ہے۔ کلیسا مرے آگے
نامعلوم	رہی ہے رات تھوڑی دل ہے مضطر دیکھئے کیا ہو	اِدھر اندیشۂ دشمن۔ اُدھر اُس نے نہیں پکڑی
،،	ہاں تو سیکھا ہے وہ مدت میں سوالِ وصل پر	کیونکہ اُس ظالم سے عرضِ عہد و پیماں کیجیے
،،	الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہو وینگے	نہ واں خو یاد آنے کی۔ نہ یاں شیوہ تقاضے کا
شفق لکھنوی	اُدھر خدا بندگی کا طالب۔ اِدھر ہے نفسِ حریص غالب	یہ روح اگر میانِ قالب۔ عجب مصیبت کے درمیاں ہے

تلوّن

کچھ مروّت بھی ہی عادت سی بھی کچھ ہیں مجبور	وعدہ بھی کرتے ہیں جھنڈی بھی لگا لیتے ہیں	تفکر سنبھل مرادآبادی
کچھ طرزِ ستم بھی ہے کچھ اندازِ وفا بھی	کھلتا نہیں حال۔ انکی طبیعت کا ذرا بھی	اکبر الٰہ آبادی
تلوّن اس قدر لے داغ۔ پھر یہ صبر کے دعوے	گھڑی میں توبہ کرتے ہو گھڑی میں دم نکلتا ہے	داغ
جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مرجاؤ	جو غش آتا ہے تو مجھ پر ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں	”
یہ کیا کہ آج کچھ ہے تو کل کچھ زبان پر	شکوہ ہو یا کہ شکر۔ مگر عمر بھر تو ہو	بیخود دہلوی
کُشتے ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے	او زمانے کی طرح۔ رنگ بدلنے والے	آتش
سیاست میں کبھی داخل ریاست میں کبھی شامل	ہمارا مولوی بھی فی المثل تھالی کا بیگن ہے	نامعلوم
اللہ رے بتوں کی تلوّن مزاجیاں	”ہاں ہاں“ گھڑی میں ہے تو گھڑی میں ”نہیں نہیں“	اخگر
اِک چیز ہے۔ اِس عالمِ ہستی میں بشر بھی	دُنیا کا طلبگار بھی۔ دُنیا سے حذر بھی	داغ
نو عمر ہیں۔ ابھی ہے تلوّن مزاج میں	غصّے کا اعتبار ہے ان کے نہ پیار کا	گستاخ رامپوری
کبھی شرم ہے کبھی شوخیاں کبھی گدگدی کبھی چٹکیاں	وہ بہارِ گلشنِ بےخزاں۔ کبھی پھول ہے کبھی خار ہے	وحشی شاہجہانپوری

تسبیح۔ زُنّار

وہی اِک ریسماں ہے جسکو ہم تم تار کہتے ہیں	کہیں تسبیح کا رشتہ۔ کہیں۔ زُنّار کہتے ہیں	بہار دہلوی
بنجائے گا یہ رشتۂ تسبیح ایک دن	دھوکا نہ کھائیو۔ کہیں زُنّار دیکھ کر	جوہر رامپوری
شیخ جی کے ہم ہیں قائل۔ کیا ہی اِک دانا ہیں	سبحہ کے پردے میں وہ پہنے ہوئے زُنّار ہیں	احسان
ہمنے مانا ہے بتوں سے زاہد و نفرت تمہیں	کیوں چھپا رکھا ہے پھر تسبیح میں زُنّار کو	ذاکر دہلوی
کھُل گیا رشتۂ زنّار سے ہم پر عقدہ	بندشیں بڑھ کے ہیں کعبہ سے بھی بتخانہ میں	ناظم لکھنوی
نغمۂ عشق سے ہیں۔ سبحہ و زنّار ملے	ایک آواز پہ دو سازکے ہیں تار ملے	نامعلوم

تواضع - خاطرداری

نامعلوم — تواضع کا طریقہ صاحبو سیکھو صراحی سے — کہ جاری فیض بھی ہو اور جھکی جاتی ہو گردن بھی

ذوق — لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی - وقتِ کرم اور زیادہ

میر انیس — خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

" — درختِ بارور جھک جاتے ہیں خود اپنے لنگر سے — غدا رزجس کو دیتا ہے - لیاقت آہی جاتی ہے

امیر مینائی — خوشا امیرِ وہ منعم کہ ہو کے دولت مند — جھکائے سر شجرِ میوہ دار کی صورت

" — راستی اور تواضع میں ہے ربطِ قلبی — جس طرح لام الف میں ہے . الف لام میں ہے

نامعلوم — پیش آ تعظیم سے جو سب جھکیں تیری طرف — کون پھر سجدہ کرے - گر خم نہ ہو محراب میں

ریاض خیرآبادی — کیوں ہوا ناوک خطا - ہے شرم سے نیچی نگاہ — لاؤ ہم رکھ لیں - کلیجہ میں تمہارے تیر کو

" — خاطرِ جنابِ شیخ کی - ہاں کچھ تو چاہیئے — ساغر انہیں جو دینا - تو دینا کھنگال کے

تکلّف

ذوق — اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے - جو تکلّف نہیں کرتا

اکبر الہ آبادی — تکلّف اُنہیں کے لئے کیجیے — فقیروں کی کیا ہے جہاں پڑ رہے

داغ — حفظِ تسلیم . ادب - خُلق - تواضع - تعظیم — کتنی تکلیف ہے اک شوقِ ملاقات کے ساتھ

عنبر — کیوں نہ تکلیف ہو تکلّف میں — وہ بھی آخر ہے . ایک خوئے ریا

فقیر دہلوی — ہے غرض دید سے یاں کام تکلّف سے نہیں — خواہ ادھر بیٹھ گئے - خواہ اُدھر بیٹھ گئے

" — دردمند . وں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے — تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

امیر مینائی — کام یاروں میں کیا . تکلّف کا — بے تکلّف . اُٹھا دو محفل سے

شوق — اے شوق تکلّف تو شرافت کا نشاں ہے — دہقان ہیں وہ جو کہ تکلّف نہیں کرتے

تقریر و تحریر۔ اندازِ بیاں

سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اسکو کہتے ہیں	اثر ہو سُننے والے پر بلاغت اسکو کہتے ہیں	اکبر الہ آبادی
دل میں کچھ چبھتی ہوئی تقریر ہونی چاہیئے	نالہ کیسا بات میں تاثیر ہونی چاہیئے	بیخود دہلوی
بات وہ کہئے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں	کوئی پہلو تو رہے۔ بات بدلنے کے لئے	″
نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر	اور جو ہوتا ہے تو باتوں میں اثر ہوتا ہے	مائل دہلوی
اثر لبھانے کا پیارے ترے بیاں میں ہے	کسی کی آنکھ میں جادو۔ تری زباں میں ہے	نامعلوم
سُن بھی لیتا ہے حالِ دل وہ شوخ	آتے ہوں ڈھب مگر سنانے کے	جوہر رامپوری
خدا لطفِ زباں لطفِ بیاں گر دے تو اتنا دے	دلوں میں آرزو بنکے اُتر جائے سخن اپنا	داغ
عرضِ مطلب میں رکھو ہر جا خیالِ اختصار	بارِ خاطر بارہا ہوتی ہے بیجا گفتگو	ذہین
ہم نشیں ظلمِ بتاں پر چپ نہ رہنا چاہیئے	بات جب کچھ بن نہ آئے شعر کہنا چاہیئے	اکبر الہ آبادی
مُنہ کھلے خُم کا نہ واعظ۔ قلقلِ مینا کے بعد	میکدے میں طول اتنا تو نہ دے تقریر کو	ریاض خیرآبادی
بیاں کس مُنہ سے ہو وہی یار کی شیریں کلامی کا	زباں پر اپنی اب تک لذتِ تقریر پھرتی ہے	غافل
مُنہ میں نہ زباں۔ زبان میں لطفِ بیاں رہے	لب پر سخن۔ سخن میں لطافت عیاں رہے	مفتون دہلوی
سُنا کرتے ہیں پہروں دل لگا کر میرے شیون کو	سخن سنجی سکھاتا ہوں۔ نوا سنجانِ گلشن کو	مائل دہلوی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے۔ ہر طرزِ فغاں میری	کہاں سے لائیگی بلبل دہن میرا زباں میری	نامعلوم
مزا جب تھا کہ میرے مُنہ سے سنتے داستاں میری	کہاں سے لائیگا قاصد دہن میرا زباں میری	″

بند

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں	قطرے کو جو دوں آب گہر سے ملا دوں	
ذرّہ کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں	خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں	میرانیس
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں		″
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں		″

تعلیم نسواں

اکبر الٰہ آبادی	تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر	خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
قطعہ	ذی علم و متقی ہوں۔ جو ہوں اُن کے منتظم	اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں
"	علمِ مغرب پڑھ کے ہونگی ایسی خود سر بیبیاں	بیبیاں شوہر بنیں گی اور شوہر بیبیاں
"	دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں	مُلّا کا۔ محتسب کا اور خدا کا ڈر
" رباعی	دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانہ میں	مضمون نگار بیوی کا سی۔ آئی۔ ڈی کا ڈر

تلافیٔ مافات

داغ	جَور کے بعد ہے کیوں لطف یہ عادت کیا ہے	تم تلافی جو کرو۔ اسکی ضرورت کیا ہے
مومن	اگر غفلت سے باز آیا جفا کی	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
جلال	بعدِ قتل اُلفت کا اب اظہار رہنے دیجیے	آپ لپٹا کر گلے سے پیار رہنے دیجیے

ثابت قدمی

نامعلوم	حلق پر تیغ رہے۔ سینہ پہ جلّاد رہے	لب پہ ہو نام ترا۔ دل میں تری یاد رہے
ذوق	صراطِ عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا	دمِ شمشیرِ قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا
نسیم دہلوی	خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ	ہم وہ بلبل ہیں۔ یہیں خاک گلستاں ہونگے
نامعلوم	میری حالت تری فرقت میں بدل جائیگی	کیا یہ دنیا ہے کہ دو دن میں بدل جائیگی
"	جنگل ہوا کہ باغ۔ برنگِ شجر رہے	مہماں جس جگہ رہے۔ ہم عمر بھر رہے
"	رند وہ ہوں کہ مری خاک سے خُم بنتے ہیں	پاؤں مر کر بھی نہ نکلا مرا میخانے سے
غالب	گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی	یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاوینگے کیا

جوانی ۔ جوبن

چودھویں منزل میں وہ ماہِ خوش اقبال آگیا	صبر و تقوے پر جو بھاری ہے وہی سال آگیا	اکبر الہ آبادی
جوانی کی دعا۔ لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں	یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جوان ہو کر	"
اُٹھانا پڑتا تھا دن رات بارِ الفتِ خوباں	جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا	"
گلے ملنے کے اِن کافر حسینوں سے یہی دن ہیں	جوانی جب گلے ملتی ہوآ آکر لڑکپن سے	ریاض
یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہے	اے میں قربان ۔ مرا عہدِ شباب آتا ہے	"
جوانی آدمی کی مایۂ الزام ہوتی ہے	بنگاہِ نیک بھی اِس عمر میں بدنام ہوتی ہے	نامعلوم
اِک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی	اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی	داغ
عمر کی جان جوانی ۔ یہ جوانی کی ہے جان	بارہ سے بیس تلک جو ہے وہ سال اچھا ہے	امیر مینائی
یہی جب مٹ گئی مرنے سے بدتر زندگانی ہے	بشر کے واسطے جو کچھ ہے دنیا میں جوانی ہے	بیخود دہلوی
نہ دنیا کا غم تھا نہ عقبےٰ کا کھٹکا	جوانی مجھے یاد آتی ہے کیا کیا	"
چلن ان کا یہ کہتا ہے ادا آئی شباب آیا	مری قسمت یہ کہتی ہے بلا آئی ۔ عذاب آیا	نذرت میرٹھی
اچھا ہوا شباب کا عالم گزر گیا	اِک جن چڑھا ہوا تھا ۔ کہ سر سے اُتر گیا	نامعلوم
کھیل نکلا ایک مرگِ ناگہانی کے لئے	مَنّتیں مانی گئی تھیں جس جوانی کے لئے	"
اِتنے عرصہ کو حسینوں پہ شباب آتا ہے	جتنی مدّت کو کہ دریا پہ حباب آتا ہے	"
آتے ہی سبز باغ دکھا کر ہوا ہوا	جھونکا تھا اِک صبا کا زمانہ شباب کا	جلیل مانکپوری
لو جوانی آگئی ۔ اب خیر جانوں کی نہیں	وہ اُٹھا فتنہ ۔ جسے تم بھی ۔ دبا سکتے نہیں	"
صبح پیری مُنہ دکھائیگی جب اے مستِ شباب	یہ جوانی کا نشہ سارا ہرن ہو جائے گا	قیصر دہلوی
باقی نہ دل میں کوئی بھی یارب ہوس رہے	چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں میں بس رہے	امیر مینائی
بچ جائے جو دنیا میں جوانی کی ہوا سے	ہوتا ہے فرشتہ کوئی انسان نہیں ہوتا	ریاض خیرآبادی

جلانا ستانا

نامعلوم	دل جلانے میں سمجھ لو۔ کہ ضرر کس کا ہے	جس کو تم آگ لگاتے ہو۔ وہ گھر کس کا ہے
"	اٹھوں اگر۔ تو کھینچ لیں۔ دامن کو ناز سے	بیٹھوں تو پھر ستانے کو۔ ذکرِ عدو کریں
داغ	مری تربت ہی پہ ہو کر ہے۔ رہِ خانۂ غیر	اور رستہ تمہیں ملتا نہیں چلنے کے لئے
نظام رامپوری	کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام	ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو
"	یہ بھی نیا ستم ہے۔ حنا تو لگائیں غیر	اور اس کی داد چاہیں۔ وہ مجھکو دکھا کے ہاتھ
نامعلوم	ہنستی صورت پہ نہ جا۔ دل کے لگانیوالے	یہ گل اندام ہیں ہنس ہنس کے جلانے والے
بیخود دہلوی	رقیبوں سے گھل مل کے باتیں نہ کیوں ہوں	کہ منظور ہے۔ دل جلانا کسی کا
محمود "	دشمن کو مری گور پہ۔ لانا نہیں اچھا	مردے کو مسلماں کے جلانا نہیں اچھا
ذکا "	یہ بتانِ سنگدل۔ اکدم بھی کل پا دیں نہیں	عاشقوں کو جب تلک واللہ کلپا دیں نہیں
عابد	نالے کرنے پر ستایا اس نے اکثر اور بھی	کر دیا بے رحم نے مضطر کو مضطر اور بھی
رضی امروہی	اپنے دل پر وہ ذرا۔ ہاتھ تو دھر کر دیکھے	اے رضی دل جو دکھاتا ہے پرائے کوئی
مرزائی	اے یار جو کوئی کسی کو کلپائے گا	یہ یاد رہے وہ بھی۔ نہ کل پائے گا
"	اس دورِ مکافات میں سُن اے غافل (رباعی)	بیداد کرے گا آج۔ تو کل پائے گا
رشید لکھنوی	ہنس ہنس کے کہہ رہا ہے جلانا ثواب ہے	ظالم یہ میرا دل ہے۔ چراغِ حرم نہیں
رضوان	عشاق کو اتنا نہ ستا۔ او بتِ کافر	فریاد نہ سن لے۔ کہیں اللہ کسی کی
ریاض خیرآبادی	غم مجھے دیتے ہو۔ غیروں کی خوشی کے واسطے	کیوں بُرے بنتے ہو ناحق۔ تم کسی کے واسطے
نامعلوم	کیوں نشانہ مجھے تیروں کا بنا رکھا ہے	دل تو تم لے گئے اب سینہ میں کیا رکھا ہے
غالب	جلا ہے جسم جہاں۔ دل بھی جل گیا ہوگا	کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
ظفر سہارنپوری	باہیں مرے رقیب کی گردن میں ڈال کے	مجھ سے مزے وہ پوچھ رہے ہیں وصال کے

جور و جفا (دیکھو ظلم وستم حصہ دوم)

کیسی بے رحمی خدا نے اُس کے جی میں ڈالدی	بات رونے کی مری سُنکر ہنسی میں ٹال دی	معروف دہلوی
تیر پہ تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے	سینہ کس کا ہے ۔ مری جان جگر کس کا ہے	امیر مینائی
مت ستا ظالم کسی کو مت کسی کی آہ لے	دِل کے دُکھ جانیسے ناداں عرش بھی ہلجائیگا	نامعلوم
اے بتو بہر خدا ۔ درپئے آزار نہ ہو	خیر راحت نہ سہی ۔ زیست تو دشوار نہ ہو	اکبر الہ آبادی
کیوں مورد بیداد ہوں ۔ کچھ وجہ بھی اسکی	لکھا ہوا عاشق مرے مُنہ پر تو نہیں ہے	داغ
ہو رہے ہیں ظلم ۔ ہفت افلاک کے	امتحاں ہیں ۔ ایک مشتِ خاک کے	نامعلوم
رحم بھی دینا تھا تھوڑا ہائے اس خوبی کے ساتھ	تجھ سے کیا ۔ یہ گفتگو کل ۔ داورِ محشر سے ہے	میر تقی
اتنا تو جور و ظلم نہ کر مجھ فقیر پر	بندے خدا کے ہم بھی تو بندے خدا کے ہیں	ضامن
پھیر لینگے مُنہ نہ ہرگز اس شوخ کی جفا سے	ہو گا یہی نہ آخر ۔ مر جائیں گے بلا سے	وصال دہلوی
جی چاہا جدھر چھوڑ دیا ۔ تیر قضا کو	چُٹکی میں اُڑائے ہوئے ۔ پھرتے ہیں قضا کو	رسا
نہ چین پائیگا تو بھی ظالم کسیکا خانہ خراب کر کے	یہ یاد رکھنا کہ لیگا بدلہ جناب باری حساب کر کے	نامعلوم
وہ کون سی جفا ہے کہ جو تم نے کی نہیں	وہ کونسا ستم ہے ۔ جو میں نے سہا نہیں	تصویر دہلوی
ان حسینوں نے ۔ بنا کر تختۂ مشقِ ستم	سچ تو یہ ہے چاہنے والوں کا بیڑا کر دیا	قوی امروہی
مانا کہ ستم ۔ تم نہیں کرتے ہو کسی پر	غیروں پہ کرم ہو ۔ یہ ستم بھی نہیں تھوڑا	خضر
خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی	اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی	جوہر رامپوری
ہر آن بانیِ ستم و جور ہو گئے	تم نوجوان ہوتے ہی ۔ کچھ اور ہو گئے	خورشید
ستم تازہ ۔ نئی بیداد ۔ جب ایجاد کرتے ہیں	عنایت مجھ پہ ہوتی ہے مجھے وہ یاد کرتے ہیں	ہمدم اکبر آبادی
دیکھ لے جفا شعار ۔ نہ کر اس قدر ستم	کوئی غریب جان سے بیزار ہو نہ جائے	
ہر چند خودکشی کو بُرا جانتا ہوں میں (قطعہ)	مجھ سے بھی کام یہ کہیں ناچار ہو نہ جائے	نامعلوم

جذبِ دل

مومن	جذبِ دل زور آزمانا چھوڑ دے	پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے
حیراں	آؤ گے تھام کر کلیجے کو	جذبہٗ دل اگر سلامت ہے
انشا	جذبِ دل اپنا سلامت ہے تو انشاء اللہ	کچے دھاگے سے چلے آئینگے سرکار بندھے
ضیاء صاحبہ گلشن آبادی	کھینچ لا اک شب بتِ مغرور کو	جذبہٗ دل تو ہے کس دن کیلئے
داغ	لا شب وعدہ اُسے کھینچ کے اے جذبۂ دل	حیلہ جو پاؤں میں مہندی نہ لگانے پائے
״	اثر ہے جذبِ الفت میں تو کھچکر آہی جائینگے	ہمیں پروا نہیں ہم سے اگر وہ تنکے بیٹھے ہیں
بیخود دہلوی	بُرا ہو جذبِ دل تیرا کیا کیا تو نے اے ظالم	وہ کیسے مضطرب ہو کر مرے سینے سے آلپٹے
خیال	دکھادیں گے کسی دن بے بلائے کون آتا ہے	بتادیں گے کہ جذبِ عشق کی تاثیر ایسی ہے
قوی امروہی	اب جذبِ محبت کا دکھاؤں گا تماشا	کھچکر نہ چلے آؤ۔ تو کچھ بات نہیں ہے
نامعلوم	عشق بازی نہ ہوئی یہ بھی کوئی کھیل ہوا	ہم بھی دیکھیں ہیں تو بھول تو جا۔ یاد نہ کر
مست بنارسی	لڑے ہیں آج اُنسے جذبِ دل کے آزمانیکو	نہ جائینگے وہ جب تک خود نہ آئینگے بُلانے کو
״	جذبِ دل ایسی کوئی تدبیر ہو	یار کے دل میں مری تصویر ہو
غالب	خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے	کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھچتا جائے ہے مجھ سے
״	غلط ہی جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے	نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
״	میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل	اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
رواں	اُنھیں یہ ہٹ کہ پہلو میں تمہارے ہم نہ آئینگے	ہمیں یہ ضد کہ تم کو کھینچ لینگے جذبِ کامل سے
شفق	در تک وہ آچکے تھے۔ مگر آکے پھر گئے	اے جذبِ دل۔ اثر میں۔ کہاں پر کمی ہوئی
مفتوں دہلوی	اے جذبۂ دل آج کشش اپنی دکھادے	آجائیں وہ دل تھامے ہوئے خود مرے گھر میں
داغ	دھمکیاں دیتے ہو تم۔ جذبۂ دل کی اے داغ	بندہ پرور۔ یہ محبت ہیں۔ حکومت کیسی؟

جنازہ - لاش

دیکھ لیجیے چلکے اپنے چاہنے والے کی نعش	آپ فرماتے تھے ایسے کو قضا آتی نہیں	قیصر دہلوی
اگر ہمراہِ میّت۔ دو قدم تو ساتھ آجاتا	شہیدِ ناز اے قاتل۔ دعا دیتا چلا جاتا	''
یہ رواروی سے جنازے کی ہمیں ثابت ہوا	منہ اُٹھائے ہم چلے جاتے ہیں منزل کی طرف	یوسف
کاندھوں پہ یاں جنازہ ہے ملکِ عدم میں روح	کوسوں بڑھا ہوا ہے۔ پیادہ سوار سے	ماہ
اُس بدگمان نے یہ کہا۔ میری لاش پر	اللہ رے فریب۔ کوئی جانے مر گئے	حسن بریلوی
ان کی گلی میں جس دم میرا گیا جنازہ	حسرت سے دیکھتے تھے پردہ اُٹھا اُٹھا کر	ذاکر دہلوی
اب خبر لیجیے لاش اُٹھتی ہے مجبور ہوں میں	سب مجھے آپکے کوچہ سے لیے جاتے ہیں	جدید لکھنوی
وہ آئے ہیں پشیماں۔ لاش پر	تجھے اے زندگی۔ لاؤں کہاں سے	مومن
کیوں محوِ تماشہ ہے۔ مری لاش پر عالم	کہہ دو کوئی مرتا ہے۔ تماشہ نہیں ہوتا	حیا دہلوی
یہ لاش بے کفن۔ اسدِ خستہ جاں کی ہے	حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا	غالب
گھر سے نکلو تو سہی۔ آنکھ سے دیکھو تو سہی	اقربا آئے ہیں۔ عاشق کا جنازہ لے کر	داغ
کوٹھے پہ وہ جو چھپ گئے تابوت دیکھ کر	ہم بھی کفن سے۔ منہ کو چھپائے چلے گئے	نامعلوم
دفنانا دیکھ بھال کے حسرت بھرے کی لاش	لپٹی ہوئی کفن سے۔ کوئی آرزو نہ ہو	''
مسکراتے ہوئے آئے ہیں وہ میّت پہ مری	روح قالب میں پلٹ آئے تو کچھ دور نہیں	''
خبر اُن کو ہوئی ہوگی۔ عجب کیا گر چلے آئیں	جنازہ لے چلو سوئے مزار آہستہ آہستہ	''
کانپ اُٹھے اہلِ قیامت دیکھ کر خونیں کفن	جانیوالے جاتے ہیں ان تیوروں سے سوئے دشت	محشر لکھنوی
سوئے صحرا لیچلے کوچہ سے اُسکے میری نعش	تھا یہی ڈر ان دنوں تلوا مرا کھجلائے تھا	مومن
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے	بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں	شاد
آئے ہیں تا قبر دوشا دوشِ احباب اے ریاضؔ	کچھ نہ کچھ عزت تو کی یاروں نے مرجانیکے بعد	ریاض بدایونی
کوئی کاندھا تک نہیں دیتا ہماری نعش کو	ہم خدا کے گھر بھی اپنے پاؤں سے جائینگے کیا	نازوالی خیرپور سند

ظرافت

نظیر اکبرآبادی	صبح جب بول اُٹھا مرغِ سحر گٹر ٹوں گوں	اُٹھ گئے پاس سے وہ رہگیا میں ٹٹرُوں ٹوں
داغ	مُنہ اندھیرے مجکو غافل دیکھ کر شوخی سے وہ	چپکے اُٹھ کر چلدیئے۔ پہلو میں تکیہ دھر گئے
نظیر اکبرآبادی	بیٹھے بٹھائے خُلد میں ابلیس نے نظیر	کیا دم دیا ہے حضرتِ آدم کو دیکھئے
ناسخ	انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں	ہنس کے وہ کہنے لگے۔ بستر کو جھاڑا چاہئے
داغ	اَے شیخ جو بتائے مے عشق کو حرام	ایسے کے دو لگائیے بھگو کر شراب میں
نامعلوم	کیوں نہ ہو شیخ اس قدر موٹا	روز کھاتا ہے گوشت مُرغی کا
اکبر الٰہ آبادی	ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا مُنہ نہ دیکھا	کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر
″	عادت جو پڑی ہو ہمیشہ کی وہ دُور بھلا کب ہوتی ہے	رکھی ہے چپوٹی پاکٹ میں پتلون کے نیچے دھوتی ہے
″	اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے	لیکن شہید ہو گئے۔ بی بی کی نوج سے
″	شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی	بے بھجن گائے تو مندر سے نکالا ملتا نہیں
شہیدی	جوتیاں کھا کر نہ پھر آیا رقیب	سچ مثل ہے بھوت بھاگے مار سے
گستاخ بدایونی	کہا جب ساتھ چلنے کے لئے اُس طفلِ ناداں سے	تو بولا ٹھیر جاؤ۔ پوچھ لیں ہم اپنی اماں سے
شوق	جان بھی جائے گو خرابی سے	ہاتھ اُٹھے گا نہ اس رکابی سے
انشا	ابھی کہتا ہوں دروازہ کی کُنڈی کھولدو چپکے	نہیں تو میرا سر ہے آج اور صاحب کی چوکھٹ ہے
میر تقی میر	مینے جو کہا تجھ بن کیا کیا نہ الم گزرا	بولا کہ لبے تیرا۔ روتے ہی جنم گزرا
سفلی اکبرآبادی	دروازہ کی جب ہم نے زنجیر ہلائی ہے	چمٹا لئے۔ گھر میں سے۔ ماما نکل آئی ہے
ایجاد	کیوں نہیں غیروں سے پردہ کیوں نہیں	وہ ترے خالو نہیں۔ ماموں نہیں
مومن	شام سے اپنے سو رہے وہ تو ادھر ہم ان کے کوچہ میں	ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
	کرتے ہیں آواز نہ فیری دیتے ہیں دستک تُو تُو بارہ	گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیرِ در کھڑکاتے ہیں

ایک سے ایک شبِ ہجر میں بڑھ کر آیا	کبھی پسّو۔ کبھی کھٹمل۔ کبھی مچھّر آیا	خنداں بریلوی
کل میاں حجّام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر	آج اس کوچہ میں انکی بھی حجامت ہوگئی	حجام
حجامت بنانے کو آیا تھا نائی	حجامت بناتے ہی مانگی رضائی	نامعلوم
مجھے برمحل۔ یہ مثل یاد آئی	کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی	
مُردوں کو زندہ کرتے تھے جو۔ وہ تو مر گئے	زندوں کے مارنے کو۔ مسیحِ زماں ہوئے	"
رکھے اس لالچی لڑکے کو۔ کوئی کب تلک بہلا	چلی جاتی ہے فرمایش۔ کبھی یہ لا۔ کبھی وہ لا	آبرو شاہجہانپوری
عدو کی بے حیائی پر مجھے افسوس آتا ہے	پڑے جوتے ہزاروں پہ نہ نکلا کوئے جاناں سے	گستاخ بدایونی
چڑھی جو شیخ کو افیوں تو دانہ تسبیح	سمجھ الائچی دانہ۔ تمام ٹھونگ گیا	حقیر دہلوی
قل ہو اللہ لگیں پڑھنے ہماری آنتیں	فاقہ جس روز ہوا۔ یادِ خدا بھی آئی	نامعلوم
رات شیطاں کو خواب میں دیکھا	ساری صورت۔ جناب کی سی تھی	"
اے بادہ کشو۔ شیخ کی دستار نہ تاکو	آیا ہے تو بس جھونک دو بھٹی میں چچا کو	"
ہجر کی۔ غم کی۔ شبِ تار کی۔ ایسی تیسی	کون جھنجھٹ میں پڑے یار کی ایسی تیسی	"
بال بھی۔ بال سے باریک بھی۔ معدوم بھی ہے	کیا کمر ہے۔ کمرِ یار کی۔ ایسی تیسی	"
ایک گھڑکی میں گریں دونوں زمیں پر تڑ سے	یار کی۔ یار کی تلوار کی ایسی تیسی	"
ڈرتا ہوں چونچ غیر کے آنے سے بزم میں	کمبخت لے نہ بھاگے۔ مری جوتیاں کہیں	چونچ مظفر نگری
کریگا ہمسری کیا عشق میں کوئی بھلا میری	کہ پلیں رات دن بھرتا تھا مجنوں کا چچا میری	"
کہا مجنوں کی ماں نے گالیاں دے دیکے لیلےٰ کو	موئی کلموہی مجھ سے چھین بیٹھی مامتا میری	"

مہمان کہیں جانے کو ہیں آپ بھی تیّار
بس لیجے سلام اپنا بھی وعدہ ہے کسی سے — داغ

تمام شد حصۂ اوّل (باقی حصے ملاحظہ ہوں)

قیمت حصۂ اوّل ۱۰/، دوم ۱۰/، سوم الف ۱۲/، سوم ب ۱۲/، چہارم ۱۰/، پنجم ۸/، ششم ۱۰/، ہفتم ۱۲/

ملنے کا پتہ مجیبیہ کتب خانہ۔ کلاں محل۔ دھلی

علم مجلسی المعروف بہ شعروں کی ڈکشنری

علم مجلسی حصہ دوم کا بھی چوتھا ایڈیشن تیار ہو گیا ہے۔ اس کے مضامین پہلے حصہ کے مضامین سے بھی کئی گنا دلچسپ ہیں۔ جن کی مختصر فہرست یہ ہے۔

جلوہ۔ جنوں۔ چھیڑ چھاڑ۔ چالبازی۔ حسرت۔ حنا مہندی۔ حسن و جمال۔ حالِ دل۔ حوصلہ۔ حیا شرم۔ خاموشی۔ خاکساری۔ خط و کتابت۔ خود بینی۔ خدا اپنے گدھوں کو خشکہ کھلاتا ہے۔ خدا کی دین خضاب۔ خلوت۔ خوشامد۔ خونِ ناحق۔ خود غرضی۔ خواب۔ دل۔ دردِ دل۔ درباں۔ درجاناں دنیا دار المحن۔ دوست دشمن۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ دیدار کا شوق۔ دھمکی۔ در گذر۔ دست درازی۔ دعا۔ داد فریاد۔ دیر و حرم۔ رشک۔ رخصتِ یار۔ روٹھنا منانا۔ راز و نیاز رمز و کنایہ۔ رازِ الفت۔ رازِ دل۔ روشنی طبع۔ راہ و رسم۔ رحم و کرم۔ ریاکاری۔ رند۔ زاہد۔ زکام سوگ۔ سوز و ساز۔ سخاوت۔ سادگی۔ سلام۔ مزاج پرسی۔ شوخی۔ شرارت۔ شراب۔ ساقی شکوہ شکایت۔ شب ہجر۔ شام وصل۔ شبِ وصل۔ صبح وصل۔ صلح۔ صبر۔ ضبط۔ ضد۔ طعن و تشنیع عیادت۔ عشق۔ عشق پر زور نہیں ہے۔ عاشق مزاجی۔ طویلہ کی بلا بندر کے سر۔ ظاہر داری۔ غنا غرور نخوت۔ قطع تعلق۔ قیدِ قفس۔ قاتل۔ کمر کسنی۔ کوچہ جاناں۔ کوسنا۔ گالی۔ لڑائی۔ معذرت مایوسی۔ معشوق۔ مسیحائی۔ مہمان۔ ملاقات۔ موت۔ نزع۔ مسکرانا۔ نگاہِ ناز۔ نزاکت۔ نقاب نباہنا۔ نیرنگیٔ زمانہ۔ نام و نشان۔ نالہ و زاری۔ جناب ناصح۔ ندامت۔ وطن۔ ولولہ۔ وحشت ہجر۔ ہرجائی۔ ہچکی۔ یاد۔ ظرافت۔

ناظرین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا مضامین کے تحت میں جو اشعار ہوں گے وہ کیسے پُر زور۔ دلچسپ اور چلبلے ہوں گے۔

قیمت حصہ اول ۸/ ۔ دوم ۸/ ۔ سوم الف ۱۲/ ۔ سوم ب ۱۲/ ۔ چہارم ۸/ ۔ پنجم ۸/ ۔ ششم ۸/ ۔ ہفتم ۱۲/

ملنے کا پتہ :- مجیبیہ کتب خانہ۔ کلاں محل۔ دہلی

تفسیر حقانی اردو

مصنفہ

عمدۃ المحدثین۔ فخر المفسرین شیخ العلامہ ابو محمد عبد الحق الحقانی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

جناب موصوف کے علم حدیث اور تفسیر کی دہوم تمام ہندوستان میں تھی دُور دراز سے لوگ جناب سے استفادہ حاصل کرنے کو دہلی آتے تھے اور شرف شاگردی حاصل کرتے تھے۔ جناب موصوف اُن چند بزرگوں میں سے ہیں جن کے سبب سے دہلی منبع علوم سمجھی جاتی ہے۔ جناب کی تصنیف میں سینکڑوں کتابیں نورٌ علی نور ہیں ان میں سے صرف چند کتابیں ذیل میں دیجاتی ہیں۔ منگائیے اور فائدہ اٹھائیے۔

باقی چند کتابوں کے اشتہار علم مجلسی حصہ سوم الف کے ٹائیٹل پر دیکھئے

تفسیر حقانی اردو اردو زبان میں ایسی مستند و مفصل تفسیر ہے جو جملہ مسائل و علوم اسلامیہ کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ ہر ایک آیت کی تفسیر، شان نزول نہایت تحقیق اور تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے اسی سبب سے آٹھ جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ قیمت جلد اول عہ باقی جلد و نکے دام چار چار روپیہ ہیں۔ یکبارگی سب جلدوں کے خریدنے والوں کو پچیس روپیہ میں مل سکتی ہے۔

البیان فی علوم القرآن (۱) اہل سائنس اور فلسفہ حال نے اپنے قیاسات ناقصہ کی بنا پر جو باطل نظریئے قائم کئے ہیں اور مسبب الاسباب کو نظر انداز کر کے مادہ اور اسباب کو کائنات کے کل وجود و حوادث کا دار و مدار قرار دیا ہے اہل دنیا کے اعتقادات میں مادیت کا وسوسہ ڈالکر مادہ پرستی کا سبق دیا ہے۔ اس کتاب سے پتہ چلے گا کہ اس سب کائنات کی کنجی قادر مطلق کے ہی ہاتھ میں ہے اور کوئی ذرہ اُس کے حکم بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔

(۲) اس ہی کتاب میں خدا تعالیٰ کی ازلیت۔ ابدیت۔ وحدانیت۔ الوہیت۔ جسم کے ساتھ روح کا تعلق مرنیکے بعد روح کا حال۔ عذاب ثواب۔ جنت دوزخ۔ برزخ پیغمبروں فرشتوں آسمانوں قیامت قبر کا حال۔ روح و مادہ۔ جزا و سزا غرض سینکڑوں ایسی ہی باتیں بہت واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔

(۳) سعادت و شقاوت کے علوم و مسائل کا بیان بھی ہے جسکی مختصر تفصیل یہ ہے طہارت نجاست پردہ ۔ اشیاء کی حلت و حرمت ۔ فرائض دینی و دنیوی ۔ عبادت مالی و بدنی ۔ اصول تمدن و معاشرت آداب و اخلاق حقوق العباد حقوق الوالدین ۔ مسئلہ نکاح ۔ طلاق ۔ کثیر الازدواجی وغیرہ وغیرہ غرض قرآن شریف میں جتنے مسائل و علوم ہیں سب کو تفصیل وار بیان کیا گیا ہے ۔

(۴) یہ خوبی بھی ہے کہ فاضل محقق نے تمام دیگر مذاہب کا نہایت غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کر کے معلومات حاصل کی ہیں اور ان تمام مذاہب کے چھوٹے چھوٹے فرقوں تک کا حال دیا ہے ۔ تمام مذاہب کے اعتقادات رسوم اور کتابوں کا حوالہ دیا ہے ۔ انجیل توارات زبور ۔ وید ۔ شاستر ۔ پران ۔ ژند وستا (پارسیوں کی کتاب) اور بہت سے اور مذہبوں کی کتابوں کا حال دیا ہے ۔

ہند و جوگیوں ۔ مسلمان درویشوں اور عیسائی راہبوں کے مختلف فرقوں ان کی عجیب و غریب رسوم و رواج کا حال بھی دیا ہے ۔

(۵) تمام مذاہب کے معترضین نے جو وقتاً فوقتاً اسلام پر بے شمار اعتراض کئے ہیں وہ سب اعتراضات بجنسہ درج کر کے ان کے نیچے فرداً فرداً سب کا جواب دیا ہے ۔

غرض یہ کتاب متلاشی حق کے واسطے واقفیت کا خزانہ ہے اور مسلمانوں کو پکا مسلمان اور مناظر بنانے والی کتاب ہے قیمت صرف للعہ / کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کا

نوٹ :- البیان کا ترجمہ انگریزی میں بہ صرف کثیر کرایا گیا ہے اپنے اعلیٰ حکام انگریز کو پیش کرنے کا بہترین تحفہ ہے ۔ جو کہ نہ صرف باعث خوشنودی افسر ہے بلکہ ساتھ ہی ذریعہ حصول ثواب دارین و تبلیغ بھی ہے ۔ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے واضح ہو کہ انگریز لوگ ایسی کتابیں بہت پسند کرتے ہیں ۔ جن سے انہیں ہندوستان کے مذاہب ۔ رسم و رواج ۔ دستور سے واقفیت حاصل ہو ۔

ملنے کا پتہ

مجیبیہ کتب خانہ ۔ کلاں محل دہلی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار ۔ دہلی